دیر و حرم

منظورؔ

دیر و حرم

منظور

لاہور بُک شاپ لاہور

قیمت ر مجلد 5/-

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام سردار جیون سنگھ پبلشر چھپا۔ اور لاہور بک شاپ لاہور سے شائع ہُوا۔

مطلعِ صبحِ حقیقت ہے مری شامِ مجاز !

میرے پہلو میں حرم بھی ہے صنم خانے بھی !

انتساب

اُردو زبان کے محسنِ اعظم،

علّامہ کیفیؔ دہلوی

کے نام!



علامہ کیفی

تعارف

(اثر خامہ علّامہ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی)

چودھری منظور احمد بھٹیٹھ پنجابی ہیں۔ اور ساری عمر پنجاب ہی میں رہے ہیں۔ وہ وسط پنجاب کے ایک ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے دادا چودھری حیات محمد مرحوم وزیر آباد میں آنریری مجسٹریٹ اور ذیلدار تھے۔ آپ کے والد چودھری سلطان علی اور چچا خان بہادر چودھری نادر خاں ریٹائرڈ پی۔ سی۔ ایس پنجاب کے زمیندار طبقہ میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

منظور صاحب آج کل لائل پور میں میونسپل بورڈ کے سیکرٹری ہیں۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی،

کی ڈگریاں پائے ہوئے ہیں۔

یہ مختصر ذاتی تعارف زبان کے واقف کو گہری حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ وہ حیران ہوگا۔ کہ، پنجاب میں رہ کر منظور صاحب ایسی اچھی اردو اور ہندی کیونکر لکھ سکتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ کہ منظور صاحب کے دماغ میں شعریت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی نظر سطح بین نہیں۔ نکتہ رس ہے۔ ان کا تخیل بلند اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے جذبات داخلیت کی روح و رواں اور احساسات خارجیت کی جان ہیں طبیعت میں چونکہ سلامت روی ہے۔ اس لئے سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ وہ جوان ہیں خوش مزاج ہیں۔ زندہ دل ہیں۔ اس لئے معتدل رومان کا رنگ کلام میں آنا ہی تھا۔ ان کا کلام ایمانداری کیساتھ شبابیات کی چاشنی لئے ہوئے ہے جس طرح ایک جوان آدمی کے منہ سے زہدِ خشک کی باتیں نہیں پھبتیں۔ اسی طرح، ایک سفید ریش کی زبان سے شوقِ وصال اور اضطراب اشتیاق کے ترانے بڈھے منہ مہانسے ہو کر رہ جاتے ہیں منظور صاحب کے کلام میں یہ باتیں نہیں۔ ان کا داخلی خارجیت کا انداز سہانا ہے۔ وہ مبالغہ اور تصنع سے کام نہیں لیتے۔

نہ لفظوں کے گورکھ دھندے کے پیچھے مبتلا رہتے ہیں۔ بلند آہنگی سے وہ دُور بھاگتے ہیں چھوٹے چھوٹے سلائم لفظوں سے وہ کام نکال لے جاتے ہیں جو دوسرے دقیق اور مشکل لغات اور ترکیبوں سے نہیں لے سکتے۔ چونکہ ان کا مشاہدہ تیز ہے۔ اس وجہ سے نفسیاتی واردات اور جذباتی کیفیتوں کی عکاسی میں کامیاب ہوتے ہیں۔

شاعری کی تعریف اگر کی جاسکتی ہے۔ تو اس طرح:-

جذبات واحساسات عائدہ کا ایک خاص دلآویز اور موثر
طریق سے اظہار واستشہاد۔ قوتِ متخلیہ کو الفاظ۔ اور،
اسلوبِ خاصہ سے جوش میں لانا۔ اور مناظرِ قدرت کا
دلچسپ احضار شاعری ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ موضوع اور طرز دو چیزیں ہیں جنہوں نے نقد ونظر کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ ایک کو دوسرے پر، ترجیح نہیں دی جاتی۔ بلکہ بعض ایک کو موازنہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ اور بعض دُوسرے کو میری رائے میں یہ اخراج، دونوں صورتوں میں ذہنی خطا پر مبنی ہے۔ کیونکہ شاعر انہیں موضوعوں پر تو نظم کہتا ہے جو ناثر نثر میں اور متکلم کلام میں استعمال کرتا ہے۔ جس طرح شاعر کے ہاں اسی طرح ناثر اور متکلم کے ہاں کبھی داخلیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور کبھی خارجیت کا۔ اور کبھی ایک کے رنگ کا غلبہ لئے ہوئے دونوں کا مجموعہ۔ غرضیکہ موضوع کی نوعیت میں فرق نہیں آتا۔ فرق اور امتیاز، جو شاعر اور دوسروں کے کلام میں ہے۔ وہ اسلوب اور اندازِ بیاں ہیں۔ اس لئے شاعر کے کلام میں موضوع کی نُدرت تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ جانچ اور پرکھ اس کے حسن بیاں اور اسلوب کی ہونی چاہیئے۔ ہاں موضُوع مبتذل اور پیچکارہ نہ، ہونا چاہیئے۔ بلکہ میں یہاں تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ کہ اچھا شاعر مبتذل موضوع کو وقیع بنا دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ منظور صاحب کیسے موضوعوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کس حسُن ادا اور خوش اسلوبی سے، انہیں نباہتے ہیں۔ چونکہ شاعر دیکھتا بھی ہے۔ اور سوچتا بھی ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں داخلی اور خارجی دونوں رنگ پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ غلبہ داخلیت کو حاصل ہے۔

ذہنی کوائف اور جذبات نفسیاتی کی عکاسی اور احضار جیسا صحیح اور بلا تصنع ان کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ اس

کا وجود عہدِ حاضر کے اچھا کہنے والوں میں کم نظر آتا ہے۔ لوگ ہجر و انتظار اور حسن و عشق کے جذبات میں اس کلاسیکل لفاظی، اور اسلوب آرائی سے کام لیتے ہیں۔ جو صبح و شام صحرا و گرمی کے موضوع پر مرثیوں میں اکثر پائی جاتی ہے۔

منظور مناظرِ فطرت کس بے تکلف ادا سے بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی سن لیجئے:۔

جب شام و صحر کے چکر میں ہر سال بہاریں آتی ہیں!
جب کالی گھٹا کے دامن میں بگلوں کی قطاریں آتی ہیں!
جب کوئل کوکو کرتی ہے۔ جب بوندا باندی ہوتی ہے
جب آم کا ٹپکا پڑتا ہے۔ جب گھر گھر شادی ہوتی ہے
جب کہرا خیمہ تنتا ہے جب سرد ہوائیں آتی ہیں!
جھولی میں موتی لاتی ہیں چاندی کا فرش بچھاتی ہیں!

اسی طرح شاعر ہر موسم کے مناظر پیش کرتا ہے۔ واقعیت کو شاعرانہ رنگ سے منقش تو کرتا ہے۔ مگر اس قدر کہ ان کی ہیئت کذائی لفاظی اور استعارہ و تشبیہہ کے برقع میں روپوش اور گم نہ ہو جائے۔ داخلی خارجیت کے احضار کی خوبی ملاحظہ ہو۔ ایک نظم کا عنوان ہے "ساجن آگئے پاس"۔ کہتے ہیں:۔

ساجن آگئے پاس
سکھی ری
ساجن آگئے پاس
انگ انگ سے لہر خوشی کی اٹھ کر آنکھیں چومے
دا بو پھلواڑی میں گھومے
ہر پیڑ خوشی سے جھومے
ڈالی ڈالی تتلی ناچے۔ بھنورا ڈالے راس!
ساجن آگئے پاس!

باغوں میں ہریاول لہکے۔ کھیت میں سرسوں پھولے
سُکھ ہردے میں جھولا جھولے
برہہ کے سب دُکھڑے بھولے
آنکھوں میں آنند کے آنسو بن گئی من کی آس!
ساجن آگئے پاس

منظور کی ایسی نظموں کو ہندوستانی کہنا ٹھیک ہوگا۔ ان کو ہندی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ آج کل ہندی کا مفہوم وہ زبان ہے جس میں سنسکرت کے تت سم لغات کی بھرمار ہو۔ ایسی نظمیں ان کے ہاں کثرت سے ہیں جن میں، خصوصی طور پر جنس لطیف کے جذبات کی عکاسی میں صحت کا کمال دکھایا ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ منظور صاحب ہندی جانتے ہی نہیں۔ یہ زبان اُنہوں نے اُردو سے سیکھی۔ اَور پنجابی ہے ہی اُن کی مادری زبان۔

ایک نظم "پربھات" میں صبح کا سماں اس طرح دکھاتے ہیں:۔

ٹوٹا جادو نیند کا جاگ اُٹھا سنسار!
پھول نہائے اوس میں نیا کیا سنگار
کوئل کوکی پیڑ پر اَور ممٹی پر کاگ!!
بلبل چہکی شاخ پر چھاجوں برسے راگ!!

پُورب کا پٹ کھول کر وہ دھرتی کا مان!
آیا سورج دیوتا ہاتھ میں اگنی بان!
بر میں پٹکا تیج کا سر پر سُندر تاج!
جڑے سنہری مکٹ میں نیلم اَور پکھراج

ایک نظم میں دو سکھیوں کا مکالمہ ہے۔ ایک انجان بن کر پوچھتی ہے:۔

(ایک) چندرماں کے رُوپ میں اترا مندر میں بھگوان!
من میں ہے بھیشم کی شکتی نین ارجن کے بان!
وہ چندرماں جس سے چمکے دُکھ کی کالی رات!
کون کوئی ہے؟ بول تو سجنی! بُوجھ تو من کی بات!

(دوسری) تو بگلی ہے مَیں کیا جانوں تیرے من کی بات!
مَیں کیا جانوں کون چندرماں؟ کیسی دُکھ کی رات!
کیسی شکتی. کیسا مندر؟ اَور کیسا بھگوان؟
وہ بھی کوئی پُرش ہے سجنی نین جس کے بان؟

اِس طرح نوک جھوک ہوتے ہوتے راز کُھل جاتا ہے۔اَور دوسری سکھی کہہ اُٹھتی ہے:۔

اب میں سمجھی نا وہ سادھو نا وہ سندر پیرا
اس کو جوبن رس کی اِچھا وہ متوارا تیرا!
تیرے درشن کا وہ لوبھی تیرا پریم پجاری!
تو اس کی گوکل کی رانی اَور وہ شام مراری!

اسی طرح بہت سے منظوم افسانے یا افسانچے ہیں جن میں جذباتِ الطف کے موتی برسائے ہیں جو اصلی دیسی ہندوستانی، ذہنی مناظر اَور نفیس احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ ان کو فطریت اَور روزمرہ شریفانہ زندگی کی عکاسی کہنا ان کی انتہائی مدح ہے وہی روایات وہی جذبات۔ وہی اسلوب ان نظموں میں پاؤ گے جو نیچر کی خاموش بربط سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب اُردو والوں کیخلاف یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے۔ کہ ان کا کلام دیسی روایات سے معرّا اور غیر ملکی تلازموں اور تلمیحوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ امر واقعہ کہ ایک اُردو شاعر جس کی گھریلو زبان ہندی نہیں جب ایسی زبان لکھ سکتا ہے۔ تو پھر ان کا کیا کہنا جو ہندی بولنے والوں کے پڑوس میں رہتے ہیں۔

تخیّلی صناعی کا رنگ بھی کہیں آجاتا ہے۔ اور خوب کھلتا ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "مشاہدہ" میں اسے حسن مشاہدہ کہتا ہوں۔ مُلاحظہ ہو:-

موجِ مے بن کر فلک پر چھا گیا ابرِ بہار
اس کا دامن چیر کر نکلی ہے بگلوں کی قطار
نیند سے بیدار ہو کر جس طرح وقتِ سحر!
توجدا کرتی ہے بالوں سے حسیں کلیوں کے ہار!

کمال تو یہ ہے۔ کہ مناظرِ قدرت کی نقاشی میں بھی داخلیت کی جھلک آجاتی ہے۔ ایک نظم ہے "طلوعِ قمر" کیا خوب، کہا ہے:-

جھٹپٹے کی خامشی میں دُور آبادی سے دُور — ہیں؛ دلِ مضطر، دلِ مضطر میں اک طوفانِ یاس
بیخودی، تنہائی، تاروں کی ضیا سُکڑی ہُوئی — وادیوں میں اک سکوتِ یاس اور جنگل اُداس!
اوس کی خنکی سے کلیوں کی جبیں پر تازگی! — ہلکی ہلکی بھینی بھینی دوب کے ریشوں کی باس

ایک نظم ہے "جگنو"۔ زورِ تخیّل سے کیا کیا تشبیہیں کام میں لائے ہیں۔ کہ سننے والا پھڑک جاتا ہے چند شعر یہاں دئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:-

چاند کی آنکھوں کا تارا نورِ چشمِ آفتاب! — اپنے باطن میں سمیٹے اک جہانِ اضطراب
آتشِ بے دُود سے معمُور ننھا سا ایاغ! — اُڑتا پھرتا ٹمٹماتا بزمِ فطرت کا چراغ!
رہ گیا اُڑ کر فضا میں برقِ ایمن کا شرار! — کوند بجلی کی نہاں اک دم میں اک دم آشکار

شعلۂ پرّاں ہے یا ٹوٹا ہُوا تارا کوئی !! یا شفق کی گود کا کھویا سا لختِ دل کوئی !!

آج کل جوان عمر شعراء میں ایک موضوع بہت زور شور سے چل رہا ہے۔ وُہ ہے عوام کا افلاس اَور مزدور۔ غیر معتدل اَور دھوم دھامی نگارش پسند کرنیوالے اسے اشتراکیت محض کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن منظور صاحب کے ہاں یہ محض ہمدردیٔ عامہ کی حد تک محدُود رہتا ہے۔ چنانچہ ایک نظم ہے "دوشیزۂ افلاس"۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

دیکھ کر چکتے ہُوئے کپڑوں میں حُسنِ برق پاش نشترِ احساس سے ہونے لگی دل میں خراش!
کر رہی تھی راستہ کے موڑ پر قسمت جبلی !! بھُول سی حزنوں سے قلبِ سنگِ خارا پاش پاش
حسنِ دلکش اَور گرفتارِ بلائے آب و ناں ! نوجوانی اَور اسیرِ زحمتِ فکرِ معاش!
سرنگوں، مجبوب، یوں خالق کی ٹھکرائی ہوئی پھینک دے جیسے بنا کر بُت کو کوئی بت تراش!
خامشی معصوم دِل کی آرزوؤں کا مزار، تشنہ نظروں کو نگاہِ لطف و احساں کی تلاش!
جم گیا یہ دیکھ کر میری رگوں میں خونِ گرم! دِل نہ تھا پہلو میں گویا برف کی تھی ایک قاش

ایک اَور نظم کا عنوان ہے "شب تاریک میں"۔ اس میں اَیسے مضامین ہیں۔ جو شاعر کے احسن جذبات اَور حسنِ احساس کی تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ شاعر کا دل حسّاس ہُوا کرتا ہے۔ اَور وہ کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔

وطنیّت کا رنگ بھی عہدِ حاضر کی شاعری پر چھایا ہُوا ہے۔ یہ اپنی اپنی طبیعت کا مقتضا ہے۔ کہ اس کی لے کتنی ڈگری کی رکھّے۔ اَور سم کا مہرہ کس مقام پر دکھائے۔

منظور صاحب کے ہاں اس قسم کی نظمیں ممند رسپتک سے اونچی نہیں جاتیں اَور یہی مقتضا ان کی اعتدال پسند طبیعت کا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ایک نظم ہے۔ "ایک حسینہ کے تاثرات" جو اس طرح سے شروع ہوتی ہے:۔

جھولی میں بھر کے لائی ہُوں آزادیوں کے پھُول
اپنے وطن کی ساری حسیں وادیوں کے پھُول

کسی کو یہ خوشی نصیب ہوئی ہو یا نہیں ۔ بہرحال ہر شخص کی یہی خواہش ہوا کرتی ہے ۔ کہ جس چیز جس شخص کو وہ پیار کرتا ہے ۔ وہ اُسے مل جائے ۔ مگر شاعر چونکہ قدرت کا نقّاش ہے ۔ وہ اپنے دل کو ہر حال میں خوش رکھتا ہے ۔ اور تخیّل اور حافظہ کے قلم سے وہ نقش کھینچ دیتا ہے ۔ جو ادب کے آسمان پر ستارے ہو کر چمکتے ہیں چنانچہ ایک ایسے ہی سین کو وقوعہ قرار دے کر شاعر کہتا ہے ۔

مرتسم منظر ہے وہ اب تک دلِ بے تاب پر
باہوں میں باہیں تھیں اور بیٹھے تھے ہم تالاب پر
میری آنکھیں تیرے عارض چومتی تھیں بار بار
چاند گوٹہ ٹانکتا جاتا تھا سطحِ آب پر !

یاد ہو گا چاندنی کی اک سہانی رات کو !
پیار سے میں نے دبا رکھا تھا تیرے ہات کو !
گرچہ لب خاموش تھے اور گو زبانیں بند تھیں !
پھر بھی ہم کہ سُن رہے تھے دل کی ہر اک بات کو !

تخیّل اور اسلوب جو ان نظموں میں پائے جاتے ہیں جن کا ابھی ذکر ہُوا ۔ وہی منظور صاحب کی غزلوں کا مابہ الامتیاز ہیں ۔ طوالت کے خوف سے صرف جستہ جستہ اشعار دئے جاتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

ستاروں کی طرح دامن پہ میرے جگمگاتے ہیں نظر سے گر کے بھی اشکوں کی تابانی نہیں جاتی
کرم کر باندھ دے تارِ نظر سے ان کا شیرازہ ! مرے اوراقِ ہستی کی پریشانی نہیں جاتی !

حسنِ التجا کی انتہائی لطافت کا یہ شعر حامل ہے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جو داد سے مستغنی ہے ۔ اجتہادِ فکر ملاحظہ ہو !

یہ میری چھوٹی قسمت کا نوشتہ ہی نہ ہو یارب شکستہ خط میں ہے تحریر پہچانی نہیں جاتی

داغِ دل کی قسم تجھے اَے اشک! رازِ اُلفت کو راز رہنے دے!

اس قسم کی داد نہیں دی جاسکتی۔ شاعر نے ان دو لفظوں میں حسنِ تخیّل اَور داخلی نُدرت کی دُنیا بند کر دی ہے۔ ایک معمُولی اَور عام بات کو کس دِلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔

کل قیس کے لب پر تھی اب میری زبانی ہے رودادِ محبت بھی اِک رام کہانی ہے!

دیکھئے خودی کو کس خوبی یا لطیفت خود غرضی سے مٹایا ہے:۔

جوہر خودی کا سجدوں سے مٹّی میں مِل چکا! اب ایک داغِ سنگِ درِ آستاں کا ہُوں!

حسنِ تغزل داد کے قابل ہے۔ کہتے ہیں:۔

افشاں میں اپنی مجھ کو وُہ چُن لے خدا کرے ٹُوٹا ہُوا ستارہ کِسی آسماں کا ہوں!!

اب یہ ایک سوال ہے۔ یعنی جب سبزۂ خط سے معشوق کا چہرہ اَور تیغ وتبر سے اس کے ہاتھ خالی ہو گئے۔ اَور مان لیا گیا۔ کہ شاعر کا معشوق جنسِ لطیف سے ہے۔ پھر افعال میں مونّث صیغے کیوں نہ استعمال کئے جائیں۔ میں خود نہیں استعمال کروں یا نہ کروں۔ لیکن دوستوں کے کلام میں اَیسے شعروں کو قلمزد نہیں کرتا جن میں مونّث صیغے فعل کے آئے ہوں۔ میں اِس معاملہ کو لوگوں کی پسند پر چھوڑتا ہوں۔ چنانچہ اسی مجموعے کی ایک غزل کا شعر ہے۔ شعر کیا تغزّل کی جان کہیئے:۔

کر رہا تھا میں تغافل کا گِلہ! آنکھوں آنکھوں میں مجھے جھٹلا گئیں

اسی طرز کے ایک غزل کے دو شعر جو تخیّل کی شوخی اَور جذبات کی شبابیات کا سرتاج ہیں۔ سنئے اَور داد دیجئے:۔

کیا جانئے کس چیز کی تشنہ یہ آنکھیں کچھ ان کو نگاہوں سے پلا اَور چلی جا!

دِل بھولتا جاتا ہے پھر آدابِ کلیمی! اِس شوخ کو آداب سکھا اَور چلی جا!

یہ بھی ایک رنگ ہے۔ کہتے ہیں:۔

ترے پرتوِ حسن کا معجزہ ہے! ہر اک شَے نظر آ رہی ہے گلابی!

اسے معاملہ بندی کہیئے یا جانِ تغزّل:۔

ہنسو غنچو ستارو مسکراؤ! مری آغوش میں وہ آ رہے ہیں!

محبّت میں یہ حالت ہو گئی ہے! | مَیں ان کو وُہ مجھے سمجھا رہے ہیں

تخیّل کی بلند پروازی اُور اسلوب کی چستی ملاحظہ ہو:۔

یہ تمام شعلۂ نور ہے یہ جوابِ جلوۂ طورؔ ہے! | مرے دل کی بزم تو دیکھ لی سرِ طور جا کے بھی دیکھ لے

تری برق پاش تجلّیاں کریں تابِ دید کا امتحاں! | مری بے بسی پہ ترس نہ کھا مجھے منہ دکھا کے بھی دیکھ لے

تری دلربائی کا پاس ہے یہ نہیں کہ غم مجھے راس ہے | تو کہے تو اشک بھی روک لوں یہ لہُو پلا کے بھی دیکھ لے

کیا مطلب کا مشورہ دیتے ہیں۔ کوئی جانے مان ہی لیا جائے گا۔ مگر کتنی سہانی شوخئ ادا ہے:۔

کہیں چھوڑ بھی یہ نہیں نہیں کسی بات کا بھی یقیں نہیں! | غمِ عشق ہے غمِ لا دوا۔ کہیں دل لگا کے بھی دیکھ لے

کیا خوب شاعرانہ لنترانی ہے:۔

دیکھ موسےٰ مرے آئینۂ ادراک میں دیکھ!! | تو نے اس جلوہ گہِ طُور پہ دیکھا کب ہے؟

کتنی بانکی اُور دلربا معذرت ہے۔ کہ پوری داد نہیں دی جا سکتی:۔

جان خالق کی ہے۔ دھن غیر کا ہے۔ دِل اُن کا | ہاتھ دنیا سے اٹھا لیں یہاں اپنا کیا ہے؟

اُور اشعار اس دیوان سے نہیں دئے جائیں گے۔ ذوقِ سلیم اُور وقتِ نظر کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ منظور صاحب کیا کہتے ہیں۔ اُور کس انداز میں کہتے ہیں۔ دیوان آپ کے سامنے ہے۔ اسے پڑھئیے اُور لُطف اٹھائیے۔ یہ مجموعہ اس اصلی شاعری کے چند نمونوں میں سے ہے۔ جو پنجاب کیا ملک نے پیش کئے۔ ایک مفکّر اس دیوان سے اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ آئیندہ زمانے میں، شاعری کا رنگ اُور تخیّل کی پرواز کیا ہو گی۔ اُور لسانیاتی قضیہّ ختم ہو کر کیا رنگ نکلیگا۔

میں اس مجموعہ کو پنجاب کی بہترین ادبی پیداوار سے قرار دیتا ہوں۔ اُور مجھے یقین ہے۔ کہ سنجیدہ طبیعتیں اُور، صحیح مذاق اس کی وہ قدر کریں گے جس کا وہ مستحق ہے۔

کیفیؔ

دہلی
۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء

پیش لفظ

از محترمہ نجمہ تصدق صاحبہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

"شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے" منظور صاحب اس عالمگیر صداقت کے واضح مظہر ہیں۔ آپ نے تیرہ برس کی عمر میں، شعر کہنے شروع کئے تھے۔ آپ کی ابتدائی ادبی جولانیاں احباب کی محفلوں تک محدود تھیں۔ اعلےٰ تعلیم کے دوران میں، منظور صاحب نے یکلخت خاموشی اختیار کر لی۔ اور یہ جمود کئی سال تک طاری رہا۔

اس عرصہ میں منظور صاحب لاء کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے آبائی وطن وزیر آباد کو خیر باد کہہ کر ملازمت کے سلسلہ میں لائلپور میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ سرزمین لائل پور کی گلریز وادیوں نے آپ کی حسیات لطیف کو پھر بیدار کیا۔ اسی اثناء میں آپ کو علامۂ محترم پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اور علامہ ممدوح کی نظر التفات نے نظم اردو کے آئندہ سہارے کے لئے منظور صاحب کو منتخب کیا۔ آپ نے پہلی ملاقاتوں میں ہی اس "جوہر قابل" کو جانچ لیا۔ اور محسوس کیا۔ کہ پنجاب کے ایک گمنام قصبے میں پیدا ہونے والا یہ ہونہار سپوت ایک روز اردو شاعری کے لئے مایۂ صد ناز ہو گا۔

۱۹۳۷ء کے وسط میں منظور صاحب کو مشیت نے شفقت مادری سے محروم کر دیا۔ یہ ان کے حساس دل پر ایک ضرب کاری تھی جو شاید فطرت نے عمداً اُن کے جوہر ہائے پنہاں کو نمایاں کرنے کے لئے لگائی تھی۔ یہ جانگزا، حادثہ سازِ دل پر مضراب ثابت ہوا۔ اور ان کے دل کا درد شعر بن کر بہہ نکلا۔ یہ نئے دور کی ابتدا تھی۔ "دیر و حرم" اس دور کی تخلیق ہے۔ اس مجموعہ میں صرف دو نظمیں "ایک رقاصہ سے" اور "شب تاریک میں" پہلے دور کی یادگار ہیں۔ یا ایک دو غزلیات۔

منظور صاحب کی جدید شاعری کی عمر صرف تین سال ہوگی۔ اس قلیل عرصہ میں آپ نے جو شہرت، حاصل کی ہے۔ وہ آپ کے حسن کلام کی شاہد ہے۔

"دیر و حرم" پر تبصرہ کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ شعر اور اس کی حقیقت و ماہیت پر روشنی، ڈالی جائے۔ شعر و نثر میں کیا مابہ الامتیاز ہے۔ اس کے جواب میں ضخیم مجلدات لکھی جا چکی ہیں۔ اور خاص کر جرمن نقادان فن، نے تو خوب موشگافیاں کی ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر کے اندر کوئی لامتناہی اور غیر محدود شئے ہے۔ اور اس کی ہر بات اس خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس خیال کی صحت پر اگرچہ کوئی قطعی حکم تو نہیں لگایا جا سکتا۔ تاہم اس کے اندر ایک گونہ ضیائے واقعیت پنہاں ہے۔ اس موقعہ پر کارلائل لکھتا ہے۔

"میرے خیال میں شعر کو مقفّیٰ اور مترنّم عبارت کہنا زیادہ قرین مصلحت ہے۔ لیکن کیا محض ہم قافیہ الفاظ کا طومار کافی ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ رُوح کی گہرائیوں کے ترنّم کی ضرورت ہے۔ جس کلام میں ایسا ترنّم موجود ہے۔ وہ شعر ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔"

علامہ عبدالرّحمٰن بجنوری تحریر فرماتے ہیں:۔

"شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی حدِ نگاہ کے مطابق حقیقت و مجاز۔ جذبہ اور وجدان تخیّل کی لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ لیکن درحقیقت شاعری انکشافِ حیات ہے جس طرح زندگی اپنی حدود میں محدُود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعیّن ہے۔ جمالِ الٰہی ہر شے میں رُونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرتیں جو صفاتِ باری سے ہیں۔ شاعر کو بھی ارزاں کی گئی ہیں۔، جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں۔ شاعر اس کام کو، علی الاعلان کرتا ہے۔"

بجنوری کا یہ خیال کہ شاعری انکشافِ حیات ہے۔ آرنلڈ کے اس خیال سے ملتا جُلتا ہے۔ کہ

"شعر تنقیدِ حیات کا دوسرا نام ہے۔"

اس جگہ یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کے علاوہ کوئی چیز شعر کا موضوع نہیں بن سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں۔ کہ شعراء نے اکثر ایسی چیزوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ جو بادی النظر میں انسانی زندگی سے ماورا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ جب انسانی زندگی کے علاوہ کسی اَور چیز کو شعر کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ تو، اس وقت وہ چیز بنفسہٖ موضوع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس شے کے ساتھ انسان کو جو تعلّق ہوتا ہے۔ وہ موضوع ہوتا ہے۔، بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ صرف وہی موضوع شعر کے لئے موزوں ہو سکتا ہے جس سے انسان کو تعلق ہو۔ صناع کا فرض ہے۔ کہ زندگی کے مرکز یعنی انسان سے شروع کرے۔ کیونکہ یہی وُہ موضوع ہے جس کے متعلق وہ بہت کچھ، جانتا ہے۔

شعر کی ایک صنف ہے جو سرتا پا حسن ہے۔ اَور وہ غزل ہے۔ اس کا محرک حسن ہے۔ موضوع حسن ہے۔ نتیجہ حسُن ہے۔ گویا یہ صنفِ شعر حسن ہی کی تخلیق ہے۔ اَور حسن ہی کی خالق ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کہ انسان مرکزِ حیات ہے۔ دل انسان کی تمام کیفیات کا مرکز ہے۔ اَور غزل وارداتِ قلب کا دوسرا نام ہے۔ پھر شاعر کا، ذوقِ جمال عام لوگوں سے کہیں زیادہ تیز اَور لطیف ہوتا ہے۔ اس کی نگاہیں ہر چیز میں تناسب و تطابق ڈھونڈتی ہیں اس کا دل گداز ہونے کے باعث فریفتگی اَور شیفتگی کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے جس صنف شعر کو اِس، واردات قلب سے تعلّق ہوتا ہے۔ وہ حسن و عشق کے افسانوں کے سوا اَور کسی چیز سے متعلق نہیں ہوتی۔ غزل کا مرکزی جذبہ حسن کے تاثرات کا اظہار اَور عشق کی کیفیات کا بیان ہے۔

"حسن موجودات عالم کے ایک ایک ذرے سے جھانک کر صاعقہ افگنی کر رہا ہے
اَور عشق کی خانماں سوزی کے شعلے فضا میں بھڑک رہے ہیں۔ یہ شاعری کے
مسلّمات ہیں۔ جس طرح ہر علم کے بعض مسلّمات ہوتے ہیں۔ شاعری فضا میں
پھیلی ہوئی ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کے نقطرے سے لبریز ہیں۔ وہ بادلوں سے
برستی ہے۔ اَور سبزے کے ساتھ روئیدہ ہوتی ہے۔ وہ حسن کے ساتھ اٹکھیلیاں
کرتی ہے۔ اَور محبّت بھرے دلوں سے کھیلتی ہے۔" (سہا بمقدمہ مطالب الغالب)

جب ہم حُسن کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو عام طور پر ایک پیکرِ آب و گِل یعنی انسان کی دلکشی یا دلفریبی سے مراد ہوتی ہو

حسن کا یہ محدود تصور ہماری کور مذاقی اور کم سوادی کی دلیل ہے۔ شاعر کیلئے نگار خانۂ فطرت کا ہر نقش حسین ہے۔ اور اسے بہر حال ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کاروانِ ناز رواں ہے جس کے غبارِ راہ سے شاعر کی چشم بصیرت روشن ہوتی ہے۔ اور سینہ جلا پاتا ہے۔ اس کی نظریں اجسام سے گزر کر فطرت کے رموز و اسرار دیکھتی ہیں جن چیزوں پر ہم نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان میں وہ لطیف و جمیل اشارات دیکھتا ہے۔ اسے وہ نغمے سنائی دیتے ہیں جس سے رُوح بالیدہ ہوتی ہے۔ اس کے لئے سیارے اور ستارے رقص کرتے ہیں اس کے لئے آسمان کا چمن زار چراغ مہر و ماہ روشن کرتا ہے۔ برق کی درخشانی، بادل کی گرج۔ ہوا کے جھونکے، سب اس کے محرم راز ہیں۔ فطرت کے مناظر سب لوگ دیکھتے ہیں۔ اور بھول جاتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو کسی داستانِ عشق یا افسانہ سے وابستہ کر دیتا ہے۔

ناقدانِ فن نے شعر و سخن کو پرکھنے کے لئے جو معیار قائم کیا ہے۔ آیئے! "دیر و حرم" کو، اس پر پرکھ کر دیکھیں۔

دیر و حرم میں فن کاری کے وہ نادر نمونے نظر آتے ہیں۔ کہ ناظر اپنی چشم تخیل کے سامنے افسانہائے جمال و داستان ہائے محبت کا ایک قصر رنگین تعمیر ہوتا دیکھتا ہے۔ حسین و جمیل الفاظ اور رنگین و دلآویز تراکیب سے منظور صاحب نے بے مثال صنعت سے شعر کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ منظور صاحب کی شاعری کا ایک پہلو شباب کی مستانہ ترنگوں کی تصویر کشی۔ اور جوانی کی حسین امنگوں کی چہرہ کشائی ہے جس کو تخیل کی رنگینی۔ الفاظ کی موسیقیت اور حسن بیان کے اوصاف نے اور بھی چار چاند لگا دئیے ہیں۔ منظر نگاری ایک اور پہلو ہے جس کو شاعر نے اچھوتی اور نادر تشبیہات سے دلکشی اور دلربائی کا جامہ پہنا دیا ہے۔

سب سے پہلے منظور صاحب کی نظموں کے متعلق عرض کرنا ہے۔ یوں تو منظور صاحب نے سب، اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور بفضل تعالےٰ کامیاب رہے ہیں۔ لیکن دیر و حرم میں سب سے زیادہ آپ کو نظمیں ملیں گی۔ ان نظموں کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ "رومانی نظمیں" "مناظر قدرت"۔ "قومی، ملی اور وطنی نظمیں"۔

اچھا تو سب سے پہلے رومانی نظموں کو ہی لے لیجئے!

"دیر و حرم" میں آپ کو بہت سی رُومانی نظمیں ملیں گی۔ جو تمام کی تمام دلکشی اور جاذبیت کا مُرقع ہیں۔ اور ان میں رُومانیت رنگینی تخیّل کی بلندی۔ جدّت طرازی۔ ترنّم سب ہی کچھ پایا جاتا ہے۔ لیکن حسب ذیل چند نظمیں ایسی ہیں۔ کہ جی چاہتا ہے۔ ان کو بار بار پڑھتے رہیں۔ "بُوجھ تو من کی بات"۔ "ہونے دے بدنام"۔ "رُویت ہلال"۔ "آج اسے تنویر کہتے ہیں"۔ "ندی کنارے گاگرلے کر جل بھرنے کو آئے"۔ "ایک مست ناز کو گھر سے نکلتے دیکھ کر" "اے آنکھوں کی تنویر"۔ "پھولوں کی شہزادی"۔ "لٹاتی چلی جا"۔ "خواب سے بیدار ہو کر"۔ "چھوڑ دے چھوڑ کے جانے کا خیال"۔ "مری محبت قبول کر لے"۔ "پردیسی پریتم سے"۔

ان منظومات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ منظور صاحب کے کلام میں رومان کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہے۔ اور شوخی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔ زبان کی شیرینی اور لطافت ایک اور خوبی ہے۔ جس نے ان نظموں کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ ان نظموں میں سے بعض موسیقی کے اعتبار سے مکمّل آرکسٹرا (orchestra) ہیں۔

منظور صاحب کے ہاں دوسرے رومانی شعراء کیطرح نامانوس ماحول اور غیر ملکی رنگ آپ کو نہیں ملے گا۔ منظور صاحب ہندوستان میں رہ کر دجلہ و فرات جیحوں و سیحوں۔ شیریں فرہاد۔ وامق عذرا کے خواب نہیں دیکھتے۔ وہ جیحوں سیحوں اور دجلہ و فرات کی جگہ گنگا جمنا۔ جہلم اور چناب کی وادیوں میں گلگشت کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں آپ کو ان نظموں میں کہیں فارسی کی لمبی لمبی تراکیب اور ادق الفاظ جو کانوں پر گراں گزریں۔ ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے۔ بلکہ نہایت پیارے پیارے اور دلکش الفاظ ملیں گے۔ جن میں ہندی کی چاشنی ہے۔ اس طرح منظور صاحب نے اپنے لئے ایک الگ راہ قایم کر لی ہے۔ انہوں نے اپنے سارے کلام کو اسی خاص رنگ میں رنگا ہے۔ اور نہائیت کامیاب رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ آنیوالے شعراء منظور صاحب کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے فخر سمجھیں گے۔ آیئے اب منظور صاحب کی رومانی نظموں سے

لطف اندوز ہوں۔

"رویت ہلال" ایک چھوٹی سی حسین نظم ہے۔ شاعر اپنے محبوب کو عید کا چاند دیکھنے میں محو پاتا ہے۔ اور نہایت ہی عمدہ پیرائے میں اپنی عید کی یاد دلاتا ہے۔ جانتے ہیں آپ شاعر کی عید کیا ہے ؟ محبوب کی دید! گو یہ عام خیال ہے۔ لیکن جن حسین و جمیل الفاظ کے ساتھ منظور صاحب نے اس واقعہ کو قلمبند کیا ہے۔ وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔

میں سمجھا وہ خط نور کا ننھی سا؛ وہی شے کہ جس کی تجھے آرزو ہے
وہ افلاک کا چاند ہے تو زمیں کا! تو دھرتی کی وہ چرخ کی آبرو ہے
تو گم اس میں اور میں تری دید میں گم تر اچاند وہ ہے مرا چاند تو ہے

اس نظم میں قدرتی چاند اور منظور کے چاند کا تقابل کیا پر لطف چیز ہے۔

"آج" ایک نہایت رنگین اور دلآویز نظم ہے۔ ہر چند اس نظم میں عریانیت کی جھلک ہے۔ لیکن وہ طبع لطیف پر گراں نہیں گزرتی۔ اس نظم میں منظور صاحب نے فن کاری کے وہ وہ نمونے پیش کئے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ شعر:-

میں کہکشاں سے کر رہا ہوں پرسش جمیل! انجم مرے جلیس قمر راز داں ہے آج!

پرسش جمیل کا لطف وجدان سلیم ہی اٹھا سکتا ہے۔

کچھ ولولوں کے پھول ہیں کچھ اشک اشتیاق! پیش حضور عشق کا یہ ارمغاں ہے آج!

ولولوں کے پھول اور اشک اشتیاق کی ترکیبیں ملاحظہ فرمایئے۔

"اسے تنویر کہتے ہیں" اپنی قسم کی نرالی چیز ہے۔ شاعر نے تنویر کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس قدر جاذب نظر ہے۔ کہ حسن نگاہ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ساری نظم مرصع ہے۔ انتخاب مشکل ہے۔

"ندی کنارے گاگرے کر جل بھرنے کو آئے" کتنی شیریں اور روح پرور چیز ہے۔ اس حسین نظم کا ہر مصرعہ ہر شعر اور ہر بند اپنے دامن میں ہزاروں رنگینیاں سمیٹے ہوئے ہے۔

منظور صاحب کی رومانی شاعری کے مختصر تعارف کے بعد غزل کو لیجئے۔ غزل میں بھی انہوں نے، اپنی طبعی شوخی، جدّت اور ندرت کو برقرار رکھا ہے۔ فرسودہ اور کہنہ مضامین کا ان کے ہاں گزر نہیں۔ میں اس تبصرہ میں ایک غزل کے چند اشعار نمونتہً پیش کرتی ہوں۔ اور عدم گنجائش کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتی ہوں۔

یہ شوخ نظر توبہ یہ چال معاذاللہ — اُڑتے ہوئے شعلے ہیں بہتا ہُوا پانی ہے!

اک گوشۂ عزلت میں اک بامِ تماشا پر! — یہ میری تمنّا ہے۔ وہ تیری جوانی ہے!

اک دودِ چراغِ دل اِک بوئے گلِ رعنا! — یہ میرا فسانہ ہے۔ وہ تیری کہانی ہے!

گلزار میں اے مہوش کچھ دیر ٹھہر جانا! — خوشبو ترے بالوں کی غنچوں میں بسانی ہے!

اس غزل میں نادر تشبیہیں اور کامل تغازل داد سے مستغنی ہے۔

منظور صاحب نے مناظرِ قدرت کو بیان کرنے میں وہ رنگینیاں اور لطافتیں پیدا کی ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ مناظرِ قدرت کے سچے پرستار ہیں۔ اور انہوں نے مختلف مناظر کو اس عمدگی سے نبھایا ہے۔ کہ، بیان سے باہر ہے۔ دیر وحرم میں آپ کو ایسی بہت سی منظومات ملیں گی جن میں انہوں نے اپنا خاص رنگ قائم رکھا ہے۔ "پربھات"۔ "جگنو"۔ "طلوعِ قمر"۔ اور "گاؤں کا ٹیلہ" منظور صاحب کے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔

"جگنو" کی نادر، اچھوتی اور لاجواب تشبیہات پڑھ کر علامہ اقبال نوراللہ مرقدہٗ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ عرصہ ہُوا میں نے دورانِ تعلیم میں علامہ مرحوم کی نظم پڑھی تھی۔ لیکن منظور صاحب کی یہ نظم پڑھ کر مجھے ایسا معلوم، ہونے لگا۔ گویا علامہ مرحوم کی رُوح منظور صاحب میں عود کر آئی ہے۔ اب آپ ان لطیف وعمدہ تشبیہات کو، ملاحظہ فرمایئے۔ "چاند کی آنکھوں کا تارا"۔ "نورِ چشمِ آفتاب"۔ "آتش بے دُود سے معمور ننھا سا ایاغ"۔ "بزمِ فطرت کا اُڑتا پھرتا ٹمٹماتا چراغ"۔ "برقِ ایمن کا شرار"۔ "شعلۂ پرّاں"۔ "شفق کی گود کا کھویا سا نظارہ"۔ "مہوش سُہاگن کے حسین عارض کا نور"۔ "صبا کے دوش پر ضیائے شمعِ طور"۔ "کسی کے سوختہ اقبال کا شرارہ"۔ "مانگ کا سیندور" وغیرہ۔

دیکھا آپ نے۔ یہ ہے زورِ بیان۔ اسے کہتے ہیں لطافت وجدت طرازی۔ یہ ہے۔ شاعرانہ کمال

اَور قادر الکلامی - اللہ اللہ - کیا نُدرت ہے ۔

"طلوعِ قمر" ایک اَور حسین نظم ہے ۔ جس میں منظور صاحب نے فطرت کے ساتھ والہانہ فریفتگی و شیفتگی، کا اظہار کیا ہے ۔ اَور ایک سماں باندھ کر رکھ دیا ہے ۔ ان منظومات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے ۔ کہ منظور صاحب حسنِ فطرت کی عکاسی میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں ۔ اَور ان کو مناظر سے ایک گونہ شغف ہے ۔ کسی حسین منظر کو دیکھتے ہی اُن کا دِل پھڑک جاتا ہے ۔ روح بے تاب ہو جاتی ہے ۔ اَور لُور پارے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دئے جاتے ہیں ۔

منظور صاحب کی دلچسپ رُومانی نظموں اَور مناظرِ قدرت کی رنگینی سے یہ اندازہ لگانا ۔ کہ وہ ایک رومانی، شاعر ہیں ۔ بالکل غلط ہے ۔ مانا کہ ان کے کلام میں رومان کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ لیکن نہیں ۔ ان کے پہلو میں ایک حساس دِل ہے ۔ اَور دِل میں درد ہے ۔ پھر اُن کے نازک دِل پر ایک معمولی سی ٹیس نشتر کا کام دیتی ہے ۔ اَور شاعری کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے ۔ منظور صاحب غربت کے بھیانک منظر دیکھ کر بے اختیار ہو جاتے ہیں ۔ دِل کا درد شعر بن کر بہنے لگتا ہے اس دعوے کے جواز میں مندرجہ ذیل نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ "دوشیزۂ افلاس" "شب تاریک میں" "جب دنیا ٹھکراتی ہے" وغیرہ ۔

منظور صاحب کی رومانی نظموں اَور غزلوں سے گمان گزرتا ہے ۔ کہ وہ ایک رندِ خراباتی ہونگے ۔ لیکن حالات اس کے بالکل برعکس ہیں ۔ نہ صرف انہیں شراب سے سخت نفرت ہے ۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں ۔ کہ دوسرے بھی اِسے ہاتھ نہ لگائیں ۔

زیرِ نظر مجموعہ میں ان کی ایک نظم "الطاف کے نام" ہے جس میں انہوں نے اپنے عزیز دوست، شاعرِ شباب حضرت الطاف مشہدی کو طرح طرح کے دلائل سے اس اُمّ الخبائث سے باز رہنے کی تلقین، کی ہے ۔ چنانچہ لکھا ہے :-

زندگانی کی نچھاور ایک ہنستے جام پر! — مَیں کفِ افسوس ملتا ہُوں ترے انجام پر!

حیف کیوں نہ آئے لٹتے دیکھ کر اَے غمگسار! — ایک کڑوے گھونٹ کے بدلے جوانی کی بہار

کیوں نہ ہو اے دوست دنیا میں مجھے جینا وبال! — دیکھ کر تیری سحر میں نکہتِ شام ملال!

بوالعجب کیا آگ بجھتی ہو جہاں بن آگ سے!   کھیلتا ہے کیوں کھلونا جان کر تو ناگ سے!

کاش! الطاف مشہدی یہ نظم پڑھ کر منظور صاحب کے دِلی جذبات کا احترام کریں۔ ان اشعار میں شاعر نے حقایق کا ایک دفتر کھول دیا ہے۔ اور انہی حقایق کی روشنی میں خودداری کا سبق دیا ہے۔ کاش! منظور صاحب کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

اس مجموعہ کلام میں آپ کو چار منظوم افسانے ملیں گے۔ "راجہ رانی"۔ "ماتما"۔ "ستی"۔ اور "اے سکھی"۔ یہ چاروں افسانے اُردو کے نادر شہکار ہیں۔ ان کا اسلوب بیان۔ تراکیب کی چستی۔ سلاست اور روانی قابلِ داد ہے۔ ان کے مطالعہ سے بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس آرٹ کا مظاہرہ منظور صاحب نے ان افسانوں میں کیا ہے۔ وُہ کسی اور شاعر کو کم نصیب ہُوا ہے۔ بلکہ "راجہ رانی" نے تو ہندوستان کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کر دیا ہے۔ اور حسن بیان کو معراج کمال تک پہونچا دیا ہے۔ یہ اور دوسرے افسانے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ کہ منظور صاحب نے نفسیاتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

ایک اور خصوصیّت جو منظور صاحب کے کلام کو ممیّز کرتی ہے۔ یہ ان کی کردار نگاری ہے۔ آپ کے پیش کردہ کردار زندگی اور عمل کی متحرک تصویریں ہیں۔ گوشت اور پوست کے زندہ نمونے ہیں۔ جو آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

ہندی شاعری کی یکتا صفت یہی ہے۔ کہ اس میں "صنفِ لطیف" کی زبان سے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ فارسی اور اُردو کا دامن اس سے تہی ہے۔ منظور صاحب نے اس صداقت کو خوب پایا ہے۔ اور آپ نے اس صنف کے منہ سے کمال شستگی سے الفاظ کہلوائے ہیں۔ ایسی نظموں کا ہر لفظ منظور صاحب کے مطالعۂ جذبات کا شاہد ہے۔ اس ضمن میں آپ کے افسانے اور گیت دونوں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں چند الفاظ گیتوں کے متعلق عرض کرنا ضروری ہیں۔ گیت ان منظوم تاثرات کا نام ہے۔ جو ہر پہلو سے مکمل موسیقی ہوں۔ سراپا ترنم اور یکسر نغمہ ہوں۔ منظور صاحب کے مشہور گیت "ساجن آگئے پاس"۔ "رُوتے ہیں دو نین"۔ "پیتم ہے انجان"۔ اور "جب سے گئے پردیس پیا"۔ اگر از سرتاپا تخلیق نغمہ نہیں تو اور کیا ہیں۔

منظور صاحب نے فارسی کے حسین و جمیل الفاظ میں ہندی کے پیارے پیارے لفظوں کو اس طرح کھپایا ہو کہ ان کے ملاپ سے ایک تیسری دلکش اور منزّہ زبان پیدا ہو گئی ہے۔ جسے ہندوستانی کہتے ہیں۔ اور جس پر، ہندوستان کی آئندہ قومی زبان کی بنیادیں استوار کی جائیں گی۔

منظور صاحب نے نسوانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو جس خوبی سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ آپ ہی کا، حصہ ہے۔ ایک گیت کا عنوان ہے "جب سے گئے پردیس پیا"۔ ایک بند ملاحظہ ہو:-

پھر بوندوں نے کان میں کہدی بھولی بسری بات!

ناگن بنکر ڈسنے آئی دُکھ کی کالی رات!

رِم جھم رِم جھم میگھا برسے بھیگی ہے برسات!

پھر چھلکا ہے آنکھ کا ساگر پھر کانپی ہر گات!

برسات کا سماں پیشِ نظر ہے۔ جوگن کو پیا کی یاد ستاتی ہے۔ اندھیری رات ہے۔ لیکن پیا پاس نہیں۔ پُرانے واقعات فلم کیطرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہیں۔ آنکھ کا ساگر چھلک جاتا ہے۔ اور گات کانپتی ہے کسقدر کھلی حقیقت ہے۔ تنہائی میں اکثر بھولنے والوں کی یاد دل میں لہریں لینے لگتی ہے۔ اور تمام گذشتہ واقعات آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔

ہندوستان کے گیت لکھنے والے شعرا حضرات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں جو درجہ منظور صاحب کو حاصل ہے۔ وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔

"دیر و حرم" میں ذوقِ سلیم کی تسکین کے تمام سامان مہیا ہیں۔ یقین واثق ہے۔ کہ اہلِ نظر حضرات اس مجموعہ کی صحیح قدر کریں گے۔ اور منظور صاحب کی ادبی کاوشوں کی داد دینگے۔

لاہور۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۰ء

نجمہ تصدّق

شعر گوئی!

پچھلا پہر ہے شب کا چمکے ہوئے ہیں تارے!
فطرت کی خامشی کا پیغام سُن رہا ہوں!
کرتا ہے قید جس کے حلقوں میں بوئے گُل کو
تارِ رگِ صبا سے وہ جال بُن رہا ہوں!
عنبر فشاں ہے خامہ دامن مہک اُٹھا ہے
میں شعر کہہ رہا ہوں یا پھول چُن رہا ہوں!

پیامِ سروش

اِدھر ناؤ امواجِ سیلِ رواں پر! اُدھر چاند تاروں بھرے آسماں پر
مَیں تانیں اُڑاتا ہوا جا رہا تھا!! مرے گیت کا سحر تھا کہکشاں پر
کوئی بامِ گردوں سے برسا رہا تھا! مہکتی ضیاؤں کی کلیاں جہاں پر
میں کچھ پی چکا تھا میں کچھ گا رہا تھا! مچلتے تھے نغمات میری زباں پر
اچانک فضاؤں میں ٹوٹا ستارہ بڑھا موجۂ بادِ عنبر فشاں پر
ہوئیں مَس تخیّل سے اس کی ضیائیں کھُلی یہ حقیقت دلِ رازداں پر
”تو شاعر ہے اسرار کا ترجماں ہے نگاہیں تری رازِ کون و مکاں پر
تُو وہ مشتِ گِل ہے کہ جاروب کش ہیں ستاروں کی پلکیں ترے آستاں پر
ترے ہی تخیّل سے شادابیاں ہیں گلوں کی مہک ہیں کلی کی زباں پر

وہیں ہوگا منظور تیرا ٹھکانا،
جلیں مُرغِ تخیّل کے بھی جہاں پر

غزل!

کل قیس کے لب پر تھی اب میری زبانی ہے
رُودادِ محبّت بھی اِک رام کہانی ہے

یہ مست نظر توبہ، یہ چال معاذ اللہ!
اُڑتے ہُوئے شعلے ہیں بہتا ہُوا پانی ہے

اِک گوشۂ عزلت ہیں اِک بامِ تماشا پر!
یہ میری تمنّا ہے۔ وہ تیری جوانی ہے

اِک دُودِ چراغِ دِل اِک بوئے گُلِ رعنا!
یہ میرا افسانہ ہے۔ وُہ تیری کہانی ہے

کرنوں کا قلم لے کر خورشید کی پوروں پر!
اے برقِ نظر تیری تصویر بنانی ہے

یہ کلبۂ غم جس کی تنویر سے ہے روشن!
قندیلِ فلک! تجھ کو وُہ شمع دکھانی ہے

آ دیدۂ پھولوں کی دامانِ نظر بھر لیں
خوش رنگ مناظر ہیں اَور صبح سہانی ہے

گلزار میں اے مہوش! کچھ دیر ٹھہر جانا!
خوشبُو ترے بالوں کی غنچوں میں بسانی ہے

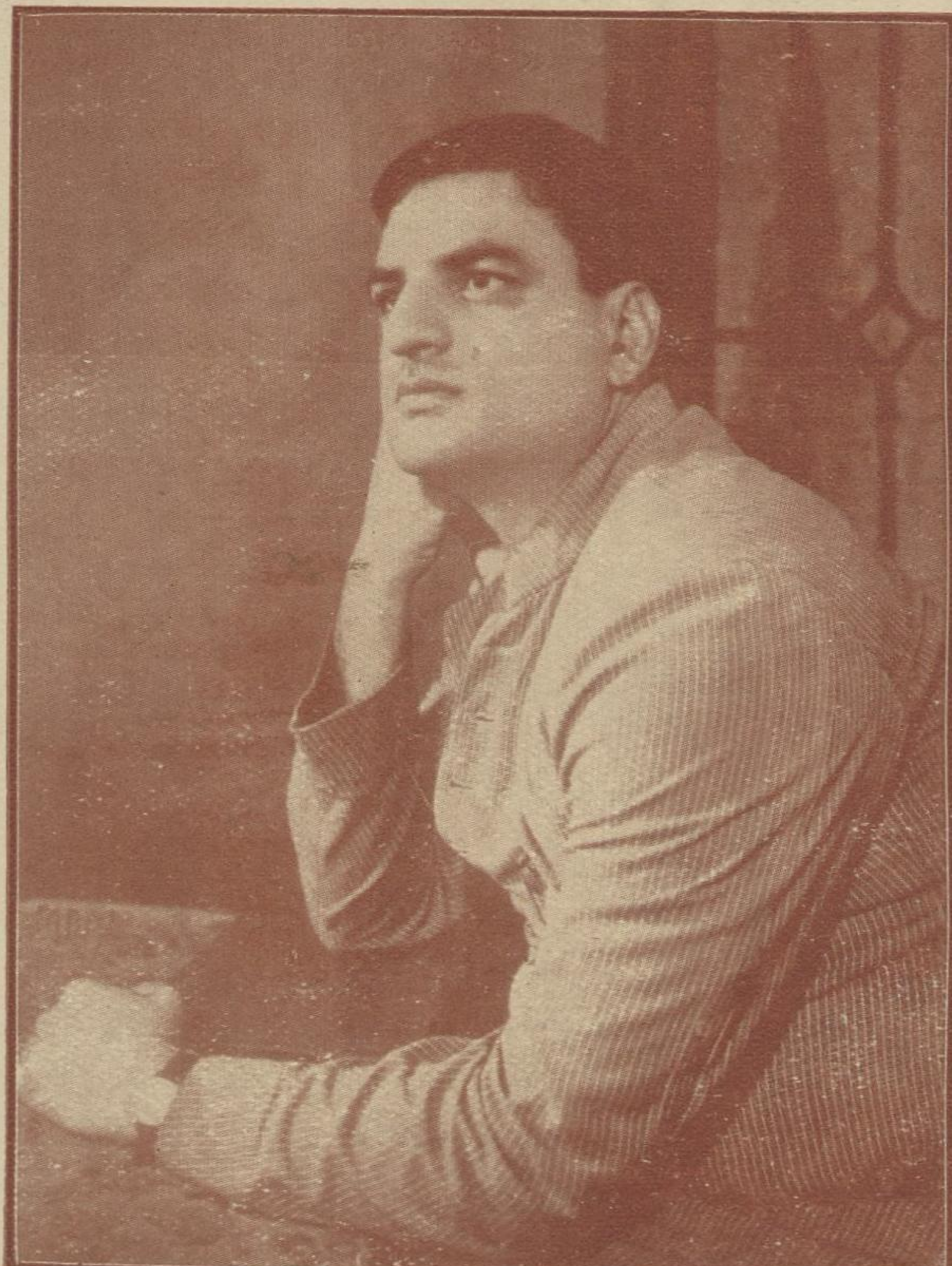
کچھ روز کی مُہلت دے منظور کو محفل میں
اے موت! ابھی دِل کی روداد سُنانی ہے

پربھات!

گلے ملے آکاش پر، بچھڑے تھے دِن رات!
ان دولنو کا میل تھا بس پل بھر کی بات!
بھیگیں پلکیں رَین کی دِن کے بھیگے نین!
نا نہیں من میں کامنا۔ ناہیں ہردے چَین!

نیر بہایا رات نے، ہنجو بھر بھر آئے!
دِن نے سینہ چیر کے دِل کے گھاؤ دِکھائے!
بکھرا کاجل رات کا، نکھرا رُوپ آکاش
ہنسے خوشی کی مَوج میں پربت پر پرکاش

ٹوٹا جادو نیند کا جاگ اُٹھا سنسار!
پھُول نہائے اوس میں بنا کیا سنگار!
کوئل کوکی پیڑ پر اور ممٹی پر کاگ!
بلبل چہکی شاخ پر چھاجوں برسے راگ!



منظور احمد منظور

پُورب کا پٹ کھول کر وہ دھرتی کا مان!!
آیا سُورج دیوتا ہاتھ میں اگنی بان!!
بر میں پٹکا تیج کا سر پر سُندر تاج!!
جڑے سنہری مُکٹ میں نیلم اور پکھراج!!
نکلا نور بکھیرتا چلتا دِھیمی چال!
بکھرے بکھرے دوش پر نرم سنہری بال!
جلوے جھومے ہاتھ میں لے کرنوں کا ہار
جیسے ناچے تال پر نئی نویلی نار

فریبِ دوستی!

فریبِ دوستی کھا کر بہت مایوس ہوتا ہے!
الم کی چار دیواری میں دل محبوس ہوتا ہے!
جہاں والوں کے اے منظور! مصنوعی تبسّم میں
کسی شے کی کمی ہے یہ مجھے محسوس ہوتا ہے

ہونے دے بدنام

شیش محل میں رقصاں ہے وہ دیکھو اِک گلفام
وُہ جس کے ہر نرم تبسّم سے خنداں ہے جام
مینا کی قُلقُل میں سُنتا ہوں اُس کا پیغام
اب کیا فکر فردا مجھ کو اَور غم انجام!
ہوتا ہوں بدنام تو اچھّا ہونے دے بدنام!

بجلی بن کر کیف کی دیوی میخانوں میں رقصاں
ستانی الھڑ دوشیزہ مستانوں میں رقصاں
جلتی پھرتی آگ کے شعلے پیمانوں میں رقصاں!
ساقی بھی ہے اور ساون کی بھیگی بھیگی شام!
ہوتا ہوں بدنام تو اچھّا ہونے دے بدنام!

میخانے کی چوکھٹ پر ہی ہو اک خون پسینا!
دُرد ملے یا باقی ساقی جو مل جائے پینا!
میخانے میں مرنا میخانے میں جینا!

مَیخواروں کے زُمرہ میں تو لکھ لے میرا نام!
ہوتا ہوں بدنام تو اچھا ہونے دے بدنام!

تو ساقی تو جام صُراحی تو مے اُور میخانہ!
تیرا پیکر کیف کی دُنیا اُور آنکھیں مستانہ!
جس میں مدرا پریم کی جھُومے وُہ ہنستا پیمانہ!

مَیں پیاسا ہُوں اس مدرا سے بھر دے میرا جام!
ہوتا ہوں بدنام تو اچھا ہونے دے بدنام!

ایک یاد!

رقم ہے اب تک وہ منظر دلِ بیتاب پر!
بانہوں میں بانہیں تھیں اور بیٹھے تھے ہم بالائے آب پر!
میری نظر میں جھومتی تھیں اُن کے عارض بار بار
چاند گوٹہ ٹانکتا جاتا تھا سطحِ آب پر!

وُہ کوئی گا رہا ہے!

کنجِ چمن میں دیکھو وُہ کوئی گا رہا ہے! — مدّھم سروں میں دلکش تانیں اُڑا رہا ہے
نغموں کا رس ہوا میں ایسے اُنڈیلتا ہے — جیسے کوئی سپیرا سانپوں سے کھیلتا ہے
دِل کی ہر ایک کروٹ نشّہ میں جھومتی ہے — آنکھوں کی مسکراہٹ بربط کو چومتی ہے!
نغمات کا تلاطم ہونٹوں کی بنسری سے — باہم اُلجھ رہا ہے تاروں کی تھرتھری سے
بربط کے لب پہ دھیمے نغمے مچل رہے ہیں — موسیقیوں کے جلوے سانچے میں ڈھل رہے ہیں!
دِل کا بخار بن کر تانیں اُبل رہی ہیں! — نغموں کے زیر و بم میں پریاں اُچھل رہی ہیں
پھر خرمنِ جنوں کو گرما رہے ہیں نغمے! — اِک آگ سی فضا میں برسا رہے ہیں نغمے

پھر دل کی دھڑکنوں کو بیتاب کر رہے ہیں
پھر خونِ زندگی کو سیماب کر رہے ہیں

فطرت کے چند زریں پُر کیف قہقہے ہیں! — جو موجِ نور بن کر کانوں میں بہ رہے ہیں
قوسِ قزح کی رنگت حل کی ہوئی ہے مے میں! — جو مُسکرا رہی ہے اس دلفریب نے میں
جاموں کی کھنکھناہٹ خندہ کی لوچ لے کر — سرگوشیوں کی حیرت شاعر کا سوز لے کر

اِن سب میں کچھ اثر کے شعلے بلا دئے ہیں
اس کے لبوں پہ میٹھے نغمے بنا دئے ہیں

ایک رقاصہ سے

یہ مانا تو اے نازنیں خوبرو ہے
ترے حسن کی روشنی سو بسو ہے
یہ مانا کہ تو نازشِ بزم جاں ہے
تو زینت دہِ قلب اہلِ جہاں ہے
یہ مانا کرشمہ ہے تو زندگی کا!
نمونہ ہے تو حسن کی سادگی کا!
یہ مانا کہ تجھ میں ہیں رنگینیاں بھی
تکلّم میں نغمہ کی شیرینیاں بھی!
مگر اے حیا سوز مجبور ہوں میں!
تجھے پیار کرنے سے معذور ہوں میں

ہٹا لے مرے سامنے سے ہٹا لے
پسِ پردہ تو روئے زیبا چھپا لے

ترا حسن بکتا ہے بازار میں کیوں؟
تو جھکتی ہے دولت کے دربار میں کیوں؟
تو کیوں مسکراتی ہے عصمت کو کھو کر!
لٹا کر جوانی کا نایاب گوہر!

تری پتلیوں میں حیا کیوں نہیں ہے   تبسّم میں رنگِ وفا کیوں نہیں ہے
گُنہ کی تنفّس میں آلائشیں ہیں   بھیانک جوانی کی زیبائشیں ہیں
جہنّم کی سینے میں آتش دبی ہے   تری زندگی بھی کوئی زندگی ہے!

ہٹا لے مرے سامنے سے ہٹا لے!
پس پردہ تو رُوئے زیبا چھُپا لے!

وُہ عصمت کا انمول شہوار موتی!   تجھے اس کی کچھ قدر اَے کاش ہوتی!
تجھے کاش آتا محبّت میں مرنا!   کسی کی جُدائی میں جی سے گذرنا!
تو پھر جان سکتی ہے کیا زندگانی!   محبّت ہے کیا اور کیا ہے جوانی!
تجھے لُطف دیتیں جوانی کی راتیں،   فسونِ محبّت سے پُرکیف باتیں!
جلا سوزِ اُلفت سے مکر و ریا کو!   مری ورنہ منظور کر التجا کو!

ہٹا لے مرے سامنے سے ہٹا لے
پس پردہ تو روئے زیبا چھُپا لے

بوجھ تو من کی بات!

پہلی سکھی۔ چندرماں کے رُوپ میں اُترا مندر میں بھگوان
من میں ہے بھیشم کی شکتی نین ارجن کے بان!
وہ چندرماں جس سے چمکے دُکھ کی کالی رات!
کون کوئی ہے بول تو سجنی بوجھ تو من کی بات!

دوسری سکھی۔ تو پگلی ہے میں کیا جانوں تیرے من کی بات!!
میں کیا جانوں کون چندرماں کیسی دُکھ کی رات!!
کیسی شکتی کیسا مندر اور کیسا بھگوان!!
وہ بھی کوئی پُرش ہے سجنی نینن جس کے بان!!

پہلی۔ مندر کے پچھواڑے سکھی ری کوئی آن براجا!
سنگت کا سردار سکھی ری یا پرجا کا راجا!
سُندر بانکا چھیل چھبیلا تیکھے تیکھے نین
من کی ہنسی ہر کی بتیاں گاوت ہے دِن رین!

دوسری۔ سُندر بانکا چھیل چھبیلا لیوے ہر کا نام!
مندر کے پچھواڑ سکھی ری کیا راجن کا کام!
جوگی ہوگا۔ روگی ہوگا۔ ہوگا سنت سپیرا
مندر کے پچھواڑے جس نے آن لگایا ڈیرا

پہلی۔ اس کے دم سے اُجڑی کٹیا اندر کا استھان!
آدھی آدھی رات کو اُٹھتی ہے دیپک کی تان!
پیارے پیارے میٹھے میٹھے مست سلونے راگ
جو سُلگاتے ہیں ہردے میں دِھیمی دِھیمی آگ!

دوسری۔ اس کے لب پر سُندر سُندر کومل کومل گیت!
یا بھگون کی آشا اُس کو یا ناری کی پریت!
یا وہ گندھارک کا چیلا یا چندرا کا داس!
تان سین کے شبد منوہر جس کے من کی آس

پہلی۔ اُس کے لب پر سانجھ سویرے پیا پیا کی کوک!
نینن میں برہا کے آنسو اور کلیجے ہُوک!
من میں ہے سنسار کی چنتا جیبھ پہ میٹھے بول!

نیر بہا کر موتی دیتا ہے ماٹی میں رول !!

دوسری۔ مایا اُس کے من کی مایا یاتر یا کی بات !!!
جس کی دُھن میں مارا مارا پھرتا ہے دن رات
یا وہ نر ہے جس کو ناری دُکھ ہتیا میں چھوڑے
پیت کی آشا توڑ کے یا پر ہت سے ناطہ جوڑے

پہلی۔ چلتے چلتے میری چوکھٹ پر آ کر رُک جائے!
سجنی اس کی آنکھ رسیلی دیکھ مجھے جھک جائے
نیچی سینتیں منہ پر لالی گات سبھی تھرائے
بھکھیالے کر بھی نا سجنی اور دوارے جائے

دُوسری۔ اب میں سمجھی نہ وہ سادھو نہ وہ سنت سپیرا
اس کو جوبن رس کی اِچھا وُہ متوارا تیرا،
تیرے درشن کا وہ لوبھی تیرا پریم پجاری
تو اس کی گوکل کی رانی اور وہ شام مراری

جگنو!

چاند کی آنکھوں کا تارا نورِ چشمِ آفتاب! — اپنے باطن میں سمیٹے اک جہانِ اضطراب
آتشِ بے دُود سے معمور ننھا سا ایاغ! — اڑتا پھرتا ٹمٹماتا بزمِ فطرت کا چراغ
رہ گیا اُڑ کر فضا میں برقِ ایمن کا شرار! — کوند بجلی کی نہاں اک دم میں اک دم آشکار
شعلۂ پرّاں ہے یا ٹوٹا ہُوا تارا کوئی! — یا شفق کی گود کا کھویا سا نظّارا کوئی!
یا کسی مہوش سہاگن کے حسیں عارض کا نور — یا صبا کے دوش پر لرزاں ضیائے شمعِ طُور
خوشنما پرکالہ ہے یا آتشِ سیّال کا! — یا شرارہ ہے کسی کے سوختہ اقبال کا
یا کسی کی مانگ کا سیندور پرّاں ہو گیا، — جل اٹھا بن کر بھبوکا شعلہ افشاں ہو گیا،

بن گیا چنگاریاں گایا ہُوا دیپک کا راگ
بام و در پر جھلملاتی تھرتھراتی سُرخ آگ!

دوشیزۂ افلاس!

دیکھ کر چمکتے ہُوئے کپڑوں میں حسنِ برق پاش — نشترِ احساس سے ہونے لگی دِل میں خراش!
کر رہی تھی راستے کے موڑ پر قسمت جلی! — پھُول سی ضربوں سے قلبِ سنگِ خارا پاش پاش
حسنِ دلکش اَور گرفتارِ بلائے آب وناں — نوجوانی اَور اسیرِ زحمتِ فکرِ معاش
سرنگوں، محجوب، یوں خالق کی ٹھکرائی ہوئی! — پھینک دے جیسے بنا کر بُت کو کوئی بُت تراش
خامشی، معصوم دِل کی آرزوؤں کا مزار! — تشنہ نظروں کو نگاہِ لطف واحساں کی تلاش
جم گیا یہ دیکھ کر میری رگوں میں خونِ گرم! — دِل نہ تھا پہلو میں گویا برف کی تھی ایک قاش
آہ احساساتِ غربت کی مسلسل زندگی! — سجدہ گاہِ آرزو اس کو بنا سکتا میں کاش!
ایک سی ہے شامِ غربت ہو کہ ہو صبحِ ملال — ایک ارمانوں کی تُربت ایک اُمیدوں کی لاش

دخترِ افلاس مَیں لایا ہوں تیری بھینٹ کو!
آنکھ کا آنسو، جگر کی ٹیس، دِل کا ارتعاش!

گزری ہوئی جوانی!

گزری ہوئی جوانی بیتی کہاں کہاں پر — کچھ میکدے میں گزری کچھ ان کے آستاں پر!
خوں ہو کے یہ جوانی آنکھوں سے بہہ گئی ہے — بربادیوں کا دل کی افسانہ کہہ گئی ہے!
حسن فغاں طلب کو عالم کا راج دے کر! — ہدیہ وفا کا دے کر غم کا خراج دے کر

اب آہِ آتشیں میں تحلیل ہو چکی ہے!
ہیئت بدل گئی ہے تبدیل ہو چکی ہے!

آتی ہے یاد اب یوں گزری ہوئی جوانی! — جیسے کوئی سنائے بھولی ہوئی کہانی
سوتے میں صبح جیسے مہکی ہوئی ہوائیں — مندر سے لپکے آئیں ناقوس کی صدائیں

دھندلی سی اک ضیا سے یوں ہے دماغ روشن
سونی کٹی میں جیسے شب کو چراغ روشن

غزل!

نگاہوں کی مے سے بھری ہے گلابی! | کوئی تھامنا! ہو چلا ہوں شرابی!
قیامت سے پہلے قیامت نہ کر دے | مری بے قراری، تری بے حجابی!
ترے پرتوِ حسن کا معجزہ ہے | ہراک شئے نظر آ رہی ہے گلابی!
اُدھر کیا؟ نگاہوں میں کچھ کچھ شرارت | اِدھر کیا مری کیفیت اضطرابی!
شفق میں مئے لالہ گوں کی جھلک ہے | فلک نے کوئی توڑ دی ہے گلابی!
مرے نغمۂ دل کی تانوں میں گم ہے | فغانِ نظیری نوائے سحابی!

مری توبہ منظور ٹوٹی کہ ٹوٹی!!
بغل میں لئے آ رہے ہیں گلابی!!

جھوٹی تسلّیاں نہ دے

جھوٹی تسلّیاں نہ دے ۔ اے رازداں! نہ چھیڑ!
خواب و خیال و وہم کی تو داستاں نہ چھیڑ!

سَو بار کھا چکا ہوں نہ دے اب حسیں فریب!
بیتی ہوئی مُسرّتوں کے دلنشیں فریب!

وُہ لمحے انبساط کے جو کھو گئے ، گئے
تحلیل خوابِ مرگ میں جو ہو گئے ، گئے

ہر پھُول جب نگاہ میں جنّت بدوش تھا!
جب ہوش تھا تو اتنا کہ مٹنے کا ہوش تھا!

جب ہر صدا تھی کیف کی دُنیا لئے ہوئے
ہر مستِ ناز حُسن کی صہبا پئے ہوئے

اُس وقت کا سُراغ لگاؤں تو کسطرح
اس کو عدم سے ڈھونڈھ کے لاؤں تو کس طرح!

طِفلی کی وہ چُہل ، وہ مسرّت شباب کی
اب اِن کا ذکر چھوڑ ، یہ باتیں ہیں خواب کی!

دھندلاہٹوں کا بھولا ہُوا اک جہاں ہیں یہ
بالُو پہ ہلکے ہلکے قدم کا نشاں ہیں یہ!

بیتی ہوئی نہ مجھ کو دِلا ۔ صحبتوں کی یاد!
عہدِ جنوں کی ہوشربا صحبتوں کی یاد!

پیمانہ بھر چکا ہے نظر کے فریب کا!
اب امتحاں نہ کر مرے صبر و شکیب کا!

اب مٹ چکی ہے کاوشِ سود و زیاں نہ چھیڑ
دکھلا نہ سبز باغ مجھے رازداں نہ چھیڑ

جب دنیا ٹھکراتی ہے

جب دنیا اور دنیا والے نفرت سے ٹھکراتے ہیں — جب شاعر کے جیون پر ادبار کے بادل چھاتے ہیں
جب نخوت کے تیور پر مرقوم حقارت ہوتی ہے — من کی شکتی پاپ کے اندھے غار میں غارت ہوتی ہے
جب مفلس کے خون کی دھاریں پانی بنکر بہتی ہیں — جب مظلومی کا افسانہ خشک نگاہیں کہتی ہیں
جب دل کی آشائیں دولت کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں — جب زر کی عفریت سے عصمت کی پریاں تھراتی ہیں
جب مزدور کے سوکھے بازو محنت سے شل ہوتے ہیں — جب غربت کے بھولے بچّے بھوک سے بیکل ہوتے ہیں
جب اُمیدوں کی دُنیا پر ظلم کی آندھی آتی ہے! — زر کی ضربوں سے معصوم محبّت کچلی جاتی ہے

تب بستی سے بن میں جاکر مارا مارا پھرتا ہوں!
یاس کی ٹھوکر سے گر گر کر اٹھتا ہوں پھر گرتا ہوں!

جب دولت کی خندہ میں افلاس کی چیخیں سنتا ہوں — تو سنسار کے گلشن سے چنتا کے کانٹے چُنتا ہوں!
خون سے روشن شمعیں جبدم دیکھتا ہوں ایوانوں میں — بن جاتا ہے برف کے ذرّے خون مری شریانوں میں
دُولت کے درباروں میں جب حسُن کو جھکتے دیکھا ہے — تو اِک تیز کٹاری بن کر خون کو رُکتے دیکھا ہے
اہلِ زر میں حسُن کے جب سرمائے بٹتے دیکھے ہیں! — کُند چھری سے اپنے دِل کے ٹکڑے کٹتے دیکھے ہیں

یاس کے دامن میں جب مفلس کی خوشیاں سو جاتی ہیں
تو میری افسردہ آنکھوں سے نیندیں کھو جاتی ہیں!

جب نفرت کے جھونکوں سے اخلاص کی آتش بجھتی ہے
تو اک تیر کا پیکاں بن کر ٹیس جگر میں چبھتی ہے!

جب دُنیا کے جانفرسا ہنگاموں سے گھبراتا ہوں!
تو فطرت کی گود میں جا کر اپنا جی بہلاتا ہوں!

آ!

شام ہے کوئی آس پاس نہیں!
چُپ ہے منظر گلوں میں باس نہیں!

تیرگی ہے نظر میں تاریکی!
تیرے آنے کی کوئی آس نہیں!

مسکراہٹ نہ قہقہوں کی گونج!
یہ خموشی تو مجھ کو راس نہیں!

آ کہ بزم خموش جاگ اُٹھے!
سو رہا ہے خروش جاگ اُٹھے

رہینِ وفا جب تری زندگی تھی!

رہینِ وفا جب تری زندگی تھی!!
تقدّس پہ حوروں کو شرمندگی تھی!!

دیا جب تجھے عقل و دانش نے دھوکا — تجھے بھاڑ میں جب تلوّن نے جھوکا!
خرد نے جلا کر پر و بال تیرے! — کئے مسخ یکسر پر و بال تیرے!

محبّت سے عاری تری زندگی ہے
تری زندگی ہے کہ شرمندگی ہے

نہ گالوں پہ سرخی نہ رونق جبیں پر! — نگاہیں جھکی جا رہی ہیں زمیں پر!
نہ جوشِ تمنّا نہ سوزِ یقیں ہے! — محبّت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

رہینِ وفا جب تری زندگی تھی!
ترے آنسوؤں میں بھی تابندگی تھی!

رؤیتِ ہلال!

سرِ شام چھت پر جو اے شعلہ رُو! ہے — وہ کیا شے ہے جس کی تجھے جستجو ہے
نگاہیں شفق میں جسے ڈھونڈتی ہیں — کسی کی تمنّا کا شاید لہو ہے
میں سمجھا وہ خطِ نور کا منحنی سا! — وہی شے کہ جس کی تجھے آرزو ہے
وہ افلاک کا چاند ہے تو زمیں کا! — تو دھرتی کی وہ چرخ کی آبرو ہے!
تو گم اس میں اور میں تری دید میں ہوں — ترا چاند وہ ہے مرا چاند تو ہے!

مہِ نو کی رؤیت سے ہے عید تیری
مری عید کیا ہے فقط دید تیری

منظور کی عید

ہے غمِ ہجر میں یوں عاشقِ مہجور کی عید!
جیسے غربت میں ہو آفت زدہ مزدور کی عید!
اس کو عالم کی مسرت کے خزانے ملتے
تیرے قدموں میں جو ہوتی ترے منظور کی عید!

ساجن آگئے پاس!

ساجن آگئے پاس — سکھی ری — ساجن آگئے پاس!

انگ انگ سے لہر خوشی کی اٹھ کر آنکھیں چومے!

وا یو پھلواڑی میں گھومے!

ہر پیڑ خوشی سے جھومے!

ڈالی ڈالی تتلی ناچے بھنورا ڈالے راس — سکھی ری — ساجن آگئے پاس!

ساجن آگئے پاس — سکھی ری — ساجن آگئے پاس!

باغوں میں اب سبزہ لہکے کھیت میں سرسوں پھولے

سُکھ ہر دے میں جھولا جھولے

برہہ کے سب دُکھڑے بھولے

آنکھوں میں آنند کے آنسو بن گئی من کی آس — سکھی ری — ساجن آگئے پاس!

ساجن آگئے پاس! سکھی ری ساجن آگئے پاس!

سمے وہ سجنی بیت گیا جب سُونے تھے دن رات

اُور اب تو نہیں وہ بات!

پت جھڑ نے کھالی مات!

کلیوں پر ہے رُوپ جوانی پھولوں میں بُو باس سکھی ری ساجن آگئے پاس

جذبِ عشق

نہ تھا کچھ اُن کو محبت کا ابتدا معلوم
وفا اور اُس کا فسوں کیا ہے یہ نہ تھا معلوم
مرے جنوں نے حقیقت یہ کھول کر رکھ دی
جو بات تھی وہ ترازو میں تول کر رکھ دی
وہ دشت دشت میں آوارہ گھومتے ہیں اب
نقوشِ پائے تمنّا کو چومتے ہیں اب

آج

پہلو میں پھر وہ نازشِ صد بوستاں ہے آج
میری رگوں میں تازہ لہو پھر رواں ہے آج

عرشِ بریں سے بھی ہے پرے کچھ دماغِ عشق
سجدہ گہِ جمال مرا آستاں ہے آج

دھوتا ہوں آنسوؤں سے ترا عارضِ حسیں
بادل کی تہ میں چشمکِ برقِ تپاں ہے آج

پتلی کمر ہے بازوؤں کے دام میں اسیر
اللہ میری آرزو کتنی جواں ہے آج

مستی سی چھن رہی ہے نگاہیں ہیں کیف بار
اک میکدہ لئے ہوئے ہر گلستاں ہے آج

انوارِ حسن سے ہے در و بام کو فروغ
یہ خاکِ تیرہ غیرتِ ہفت آسماں ہے آج

آیا ہے کیا گہن میں وہ خورشیدِ نیمروز،
عارض پہ صاف بوسۂ لب کا نشاں ہے آج

بکھرے ہوئے ہیں دوش پہ کیا نرم نرم بال
موجِ شمیم کارواں در کارواں ہے آج

کچھ ولولوں کے پھول ہیں کچھ اشکِ اشتیاق
پیشِ حضورِ عشق کا یہ ارمغاں ہے آج

قبضے میں ہے کلیدِ درِ عیش و انبساط
ہاتھوں میں میرے لطف و طرب کی عناں ہے آج

میں کہکشاں سے کر رہا ہوں پرسشِ جمیل
انجم مرے جلیس قمر رازداں ہے آج

ہوں مئے جمال کی صہبا پیئے ہوئے
اور کاروانِ ابر فلک پر رواں ہے آج

پائے سمندِ شوق اِدھر تیز تیز ہیں! دریائے لطف وجود اُدھر بیکراں ہے آج
آنکھوں میں سُکر حسن میں مستی، نظر میں کیف وُہ خلدِ ناز جامِ مئے ارغواں ہے آج
اے شوقِ ناصبور ذرا بڑھ کے رکھ قدم ائے جرأتِ حریص ترا امتحاں ہے آج

دشتِ جنوں میں ہے نہ کہیں، رہگزار میں
ڈھونڈے کوئی خراب تمنّا کہاں ہے آج

کفارۂ گناہ

چبھو کر کلیجے میں پلکوں کا بھالا
مجھے مار ڈالا مجھے مار ڈالا

اسی پر اگر اِکتفا آپ کرتے
قسم ہے خدا کی مہا پاپ کرتے

مگر میری میّت کو دے کر سہارا
اَدا کر دیا ہے گنہ کا کفارا

جانے بھی دے

ہمنشیں تنویرؔ بھولی ہے مجھے جانے بھی دے
کچھ دنوں دل کو فریبِ آرزو کھانے بھی دے

کوئی سر کرنے دے مجھ کو ہفتخوانِ راہِ عشق
کوئی جوئے شیر مجھ کو کھود کر لانے بھی دے

"ہیپت" کہیئے نوجوانی کی حسیں لغزش جسے
اس حسیں لغزش کی کچھ مجھکو سزا پانے بھی دے

بخش دی ہے رفعتِ تخئیل اس کی یاد نے
آسمانوں سے ستارے توڑ کر لانے بھی دے

نقش ہے جو دل کی ہر ذرّے پہ وہ نامِ جمیل
ہچکیوں کیساتھ ہونٹوں پر مرے آنے بھی دے

بے بسی کیوں، تیرگیٔ بخت کا احساس کیوں
نور بن کر وسعتِ افلاک پر چھانے بھی دے

وہ اگر بھولی ہے تو بیتے سمے کی یاد میں
گیت کوئی آنسوؤں کے ساز پر گانے بھی دے

اس کا میرا رابطہ یعنی یہ رودادِ الم !
نغمۂ جانسوز بن کر عرش تک جانے بھی دے

وہ اگر بھولی مجھے ہیں تو نہیں بھولا اُسے
داستانِ درد اے منظورؔ دُہرانے بھی دے

طلوعِ قمر!

جھٹپٹے کی خامشی میں دُور آبادی سے دُور
میں، دلِ مضطر، دلِ مضطر میں اِک طوفانِ یاس

بے خودی، تنہائی، تاروں کی ضیا سمٹی ہوئی
وادیوں میں اِک سکوتِ یاس اور جنگل اُداس

اوس کی خنکی سے کلیوں کی جبیں پر تازگی
ہلکی ہلکی، بھینی بھینی دوب کے ریشوں کی باس

اِس سمے میں آسماں کی خلوتوں سے کوئی حور
ہاتھ میں کرنوں کی مشعل بر میں سیمابی لباس

چُپکے چُپکے دھیرے دھیرے نور برساتی ہوئی،
مسکراتی کھلکھلاتی آکے رُک جاتی ہے پاس

اِک بھبوکا بن کے جلتا ہے مرا خونِ حیات
جاگ اٹھتی ہے جمائی لے کے نبضِ کائنات

جلنے کا بہانہ

آرزوئے دید لائی ہے یہاں
ہاں یہی امید لائی ہے یہاں
مجھ کو جلنے کا بہانہ مل گیا!!
وہ یہی بے بسی لائی ہے یہاں

آہ اقبال!

فلک کے دل میں چبھے ہیں نشتر زمیں کی چھاتی دھڑک رہی ہے
ہے رعدِ ماتم کا شور برپا الم کی بجلی کڑک رہی ہے
ہوا میں ہے دل کی شورشوں سے فغانِ محزوں کی گونج پیدا!
فضا میں قسمت کی تیرہ سامانی آج ظلمت چھڑک رہی ہے
مجھے مری ناصبوریٔ دل دکھا رہی ہے عجیب منظر!
کہ اشک لرزاں ہیں میری پلکوں پہ دل میں آتش بھڑک رہی ہے
الٰہی اس دل کی بے کلی کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا
کہ آج بیٹھے بٹھائے رہ رہ کے آنکھ میری پھڑک رہی ہے
خیال میرا درست نکلا اٹھا وہ طوفان یاس دیکھو!
وہ مہرِ اقبال چھپ گیا ہے افق میں مسجد[1] کے پاس دیکھو!

---

[1] شاہی مسجد لاہور

نورِ حقیقت!

وہ جلوہ نمائی پہ مجبُور جلوہ! جو موسےٰ نے دیکھا سرِ طور جلوہ!
وُہ پھُولوں کے رنگین جاموں میں دیکھا
جوانی کی پُر کیف شاموں میں دیکھا!
محبّت کے شیریں پیاموں میں دیکھا
وہ مخمُور جلوہ وہ پُر نور جلوہ!

جسے دیکھ کر ہوش انسان کھوئے دِل سادہ فطرت کے ارمان کھوئے
وہ رنگینیوں میں فضاؤں کی پیدا!
وہ اٹھکھیلیوں میں ہواؤں کی پیدا!
وہ جولانیوں میں گھٹاؤں کی پیدا!
وہ جس نے کہ موسےٰ کے اوسان کھوئے

وہ جس نے محبّت کو بے باکیاں دیں سخنور کی آنکھوں کو نمناکیاں دیں!

وہ گویا ہے زیر و بم زندگی ہیں!

وہ خنداں ہے بیش و کم زندگی ہیں!

دَواں اس کو دیکھا رہِ زندگی ہیں!

وہ جس نے خرد کو یہ چالاکیاں دیں!

غزل!

آنکھ میں سوز و ساز رہنے دے اشکِ حسرت طراز رہنے دے

حسرتِ دید دِل میں باقی ہے! روزنِ چشم باز رہنے دے

اس میں شرمِ گنہ نہ سوزِ جنوں زاہد اپنی نماز رہنے دے

تجھ سے لمبی ہے غم کی کالی رات شیخ زلفِ دراز رہنے دے

داغِ دِل کی قسم تجھے اے اشک

رازِ الفت کو راز رہنے دے!

اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر!

اے شوخ تری چشمِ فسوں ساز میں آنسو
موتی ہیں کہ پھولوں میں نظر تاب ہیں جگنو!

تارے ہیں مگر کہر سے دھندلائے نہیں ہیں
یہ پھول ہیں گرمی سے جو کملائے نہیں ہیں!

وہ نرگسِ شہلا ہے کہ شبنم سے بھری ہے
نیلم کی صراحی ہے کہ زمزم سے بھری ہے

یہ اشک نہیں گر مئے الفت کا نشاں ہیں!
عصمت کے نگہدار ہیں عفت کا نشاں ہیں!

ان اشکوں میں تنویرِ محبت کی جھلک ہے
بیتاب جو رکھتا ہے اسی غم کی کسک ہے

غماز ہیں پہلو میں کوئی آگ دبی ہے!
اک درد ہے جو سینے میں پوشیدہ ابھی ہے

یہ اشک شبِ ہجر کے برسائے ہوئے ہیں
تسکینِ غمِ دل کی قسم کھائے ہوئے ہیں

کبھی آؤ بھی رنجشیں دُور کر کے

شباب بہاریں کو پر نور کر کے — نگاہوں کو شوخی سے معمُور کر کے
مئے ناب الفت سے مخمور کر کے — ہر اک ذرّے کو وادیٔ طُور کر کے

کبھی آؤ بھی رنجشیں دور کر کے

نگاہوں سے کہتے ہوئے اِک کہانی — بہاتے ہوئے مستیوں کی جوانی!
لٹاتے ہوئے عشرتِ جاودانی — محبّت پہ دنیا کو مجبُور کر کے

کبھی آؤ بھی رنجشیں دور کر کے

لبِ شوق پر التجائیں ہیں رقصاں — رگ و پے میں غم کی صدائیں ہیں رقصاں
سیہ مستیوں کی گھٹائیں ہیں رقصاں! — مئے ناب سے جام بھرپور کر کے!

کبھی آؤ بھی رنجشیں دُور کر کے

غمِ عشق کی منزلت کو بڑھا کر! — چمن میں شمیمِ محبّت لٹا کر!
ستاروں کو نقشِ کفِ پا بنا کر! — اداؤں سے عالم کو مسحُور کر کے

کبھی آؤ بھی رنجشیں دور کر کے

وفاؤں کے دریا بہاتے ہوئے تم! کلی کو چٹکنا سکھاتے ہوئے تم!
تبسّم کی بجلی گراتے ہوئے تم! فضاؤں کو مستی سے معمور کر کے
کبھی آؤ بھی رنجشیں دُور کر کے

جنونِ محبّت کا احساس بن کر! کسی کی تمنّاؤں کا پاس بن کر!
مرے دل کی ٹوٹی ہوئی آس بن کر! طبیعت کو الفت پہ مجبور کر کے!
کبھی آؤ بھی رنجشیں دُور کر کے

شبستانِ آلام میں سو رہا ہوں! جوانی کی مدہوشیاں کھو رہا ہوں!
غمِ عشق میں کیا سے کیا ہو رہا ہوں! مری التجاؤں کو منظور کر کے!
کبھی آؤ بھی رنجشیں دور کر کے

گیت

چھوڑ کر ہونٹوں کو جب آوارہ ہو جاتے ہیں گیت نیلگوں افکار کی وادی میں کھو جاتے ہیں گیت!
تھرتھرا کر دل کو دیتے ہیں فریبِ دلنشیں! اور فضا کی گودیوں میں جا کے سو جاتے ہیں گیت!

تیری آنکھیں!

چشمِ نرگس کو جا کے دیکھا ہے　　خوب آنکھیں ملا کے دیکھا ہے
اس کا مجملہ ہے نور سے خالی　　سر ہو جیسے شعور سے خالی!
وہ ستارہ ضیا نہ ہو جس میں　　بانسری وہ نوا نہ ہو جس میں
جام جس میں کوئی شراب نہ ہو　　عمر جس میں کوئی شباب نہ ہو!
جس میں خنداں جوانیاں ہی نہیں!　　خوبصورت کہانیاں ہی نہیں

تیری آنکھیں وہ ہو نہیں سکتیں!
دل میں نشتر چبھو نہیں سکتیں!

چشمِ آہوئے ختن میں دیکھی ہے!　　دشت و صحرا میں بن میں دیکھی ہے
مانا اک حسن اس میں لرزاں ہے　　پرتوِ مہر اس میں رقصاں ہے
اس میں بینائی بھی ضیا بھی ہے　　جھینپ جانے کی اک ادا بھی ہے
لیکن اس میں سرور و کیف کہاں!　　اس میں سونا ہے مستیوں کا جہاں
اس کی پلکوں پہ کھیلتا ہی نہیں!　　ہلکا ہلکا تبسم رنگیں!

تیری آنکھوں کو کوئی کیا جانے
گنگناتے ہیں جن میں مے خانے

غزل

دلِ ہنگامہ طلب شورشِ دنیا کیا ہے
عیش و حرماں کا شب و روز تماشا کیا ہے

دیکھ موسٰے! مرے آئینۂ ادراک میں دیکھ
تو نے اس جلوہ گہِ طور پہ دیکھا کیا ہے

جان خالق کی ہے۔ دھن غیر کا ہے۔ دِل اُنکا
ہاتھ دنیا سے اُٹھا لیں یہاں اپنا کیا ہے

جذبِ خودداریٔ دِل! تجھ کو کہاں لے جاؤں
پوچھتے ہیں وہ بتا تیری تمنّا کیا ہے

عشق ہے حسن کے چہرے پہ نقابِ زرّیں!
مجھ سے کھل جاؤ کہ اس پردے سے پردا کیا ہے

ایک مدفن ہے تمنّاؤں کا ارمانوں کا!
دِل کی کیا کہیئے! اب اس بستی میں رکھا کیا ہے

نگۂ حسن حجابوں سے مجھے دیکھتی ہے
ابھی منظور ہوں میں آپ نے سمجھا کیا ہے

ایک نوجوان حسینہ کے تاثرات

وطن کے سٹیج پر!

جھولی میں بھر کے لائی ہوں آزادیوں کے پھول!
اپنے وطن کی ساری حسیں وادیوں کے پھول!
کچھ ان میں پھول اپنی دُعاؤں کے لائی ہوں!
کچھ پھول مرحبا کی صداؤں کے لائی ہوں!
کچھ ان میں انبساط کی کلیاں سلائی ہیں
کچھ اپنی زندگی کی امنگیں چھپائی ہیں
اِن سب کو گوندھ گوندھ کے ارماں کی تار میں
خودداری و مروّت و احساں کے تار میں!
لائی ہوں ہار ایسے مجاہد کے واسطے
جو برچھیوں کے سائے میں رکھ لے وطن کی لاج

قائم ہو جس کے فیض سے اِس انجمن کی لاج
جو گولیوں کے سامنے ہنس دے غرور سے
جو مُسکرائے شوقِ اجل کے وفور سے
جو شیر مرد بن کے ڈکارے کچھار میں
جو رعد بن کے کڑکے بیابان و لیار میں
جو اپنے ہاتھ دشمنوں کے خوں سے رنگ لے
جو تیغ کی زبان سے پیغام جنگ دے
جو اپنا سینہ تان دے خنجر کے سامنے،
آگے بڑھے جو رائیت و پرچم کو تھامنے
گرتا ہو برق بن کے جو توپ و تفنگ پر!
ہیبت سے جس کی لرزہ ہو میدانِ جنگ پر!
جو خنجروں کی پیاس بجھاتا ہو خون سے
جو رَن کو لالہ زار بناتا ہو خُون سے!
حبّ وطن کے نغمے جو گاتا ہوا بڑھے
جو موت سے نگاہیں لڑاتا ہوا بڑھے!

چینِ جبیں سے موڑ دے جو منہ تفنگ کا!
پانسہ پلٹ دے پل میں جو میدانِ جنگ کا!
جو وندنانی توپ کی آواز روک دے!
جو دشمنوں کو موت کی شعلوں میں جھوک دے
جو قلبِ رزمگاہ میں ڈٹ جائے شان سے
جو وار کھا کے تیغ کا کٹ جائے شان سے
جو سربلند کردے شجاعت کے نام کو!
جو چُوم لے خوشی سے شہادت کے جام کو!

یہ ہار میں چڑھاؤں گی اُس کے مزار پر

مسافر کی عید

یار و غمخوار ہے کوئی نہ شناسا کوئی!!
عید کے روز بھی ملتا نہیں اپنا کوئی!!
اے محبانِ وطن آپ کو معلوم بھی ہے!
کس قدر درد و غمِ عید میں تڑپا کوئی!!

الطاف کے نام

(حضرت الطاف مشہدی کی مشہور نظم "منظور کے نام" کے جواب میں ۴ ۴)

تو بہک کر اے مرے الطاف کیا کچھ کہہ گیا
بادۂ گلفام کی موجِ رواں میں بہہ گیا!!

کھو گیا کیفیّتِ آوازِ نوشا نوش میں!
سو گیا سر رکھ کے مینا کی حسیں آغوش میں

زندگانی کی نکچھاور ایک ہنستے جام پر!
ہیں کفِ افسوس ملتا ہوں ترے انجام پر

کیوں نہ ہو اے دوست! دنیا ہیں مجھے جینا وبال
دیکھ کر تیری سحر ہیں نکہتِ شامِ مَلال

حیف کیوں آئے نہ لٹتے دیکھ کر اے غمگسار
ایک کڑوے گھونٹ کے بدلے جوانی کی بہار

کیا ضرورت ہے تجھے کیفِ مئے گلنار کی!
مست کر دیگی تجھے مستی ترے اشعار کی!

کیف کی ہے اک جواں دنیا گل و گلزار میں!
جامِ گُل ہیں اور چشمِ نرگس سرشار ہیں

صبحدم گلشن ہیں پھولوں کا خمار آگیں فشار
شام کو صحرا ہیں دھیمی سی پپیہے کی پکار

نشہ بن کر چھا نہیں جاتے فضائے ہوش پر
یہ مناظر جب بہار آئی ہوئی ہو جوش پر

کیا کہا "تو آگ سے تسکینِ خاطر پائیگا
اس کے شعلوں سے ترے غم کا دیا بجھ جائیگا

بوالعجب کیا آگ بجھتی ہے جہاں میں آگ سے! کھیلتا ہے کیوں کھلونا جان کر تو ناگ سے

ساغرِ مے کو تو سمجھا ہے غلامی کا علاج اپنے احساسات کی مرگِ دوامی کا علاج

دوست میرے ہونٹ سی دیتا ہے تیرا احترام ورنہ کہتا برملا اے ہمدمِ ذی احتشام

یہ زمینِ ہند، یہ پیارا وطن، یہ ارضِ پاک! ہندیوں کیواسطے کحل البصر ہے جسکی خاک

مانگتی ہے بھیک تجھ سے جذبۂ ایثار کی، بھینٹ اس کو چاہیئے الطاف استغفار کی

چھوڑ دے اے دوست اب صہبا پرستی چھوڑ دے تو وطن کیواسطے جام و صراحی توڑ دے!

دوست اب بھی تو اگر جام و سبو چھلکائیگا! بن کے تنکا موجۂ مے میں وطن بہہ جائیگا

دل میں جو حبِ وطن کی بیج بو سکتا نہیں!
وہ سبھی کچھ ہو مگر خوددار ہو سکتا نہیں!

پیری

یوں ہوا پیری میں رخصت احتشامِ زندگی
جیسے سونی ہو فضا طوفاں گذر جانیکے بعد
یا تھکا ماندہ مسافر باندھ لے رختِ سفر
سایۂ اشجار میں کچھ دیر ستا لینے کے بعد

جب سے گئے پردیس پیا!

جب سے گئے پردیس پیا تم جب سے گئے پردیس!
ہاتھ میں کھپری، گردن مالا، جوگن کا سا بھیس!
تن پر میرے گیروا بانا، کاندھے کالے کیس!
بیاکل ہوں کل اِک پل نا نہیں ڈھونڈوں دیس بدیس!
جب سے گئے پردیس پیا تم جب سے گئے پردیس

——(۲)——

پھر بُوندوں نے کان میں کہدی بھولی بسری بات
ناگن بن کر ڈسنے آئی دُکھ کی کالی رات!
رِم جھم رِم جھم میگھا برسے بھیگی ہے برسات!
پھر چھلکا ہے آنکھ کا ساگر پھر کانپی ہے گات!
پھر بوندوں نے کان میں کہدی بھولی بسری بات

——(۳)——

ہونٹ پہ دم ہے آنکھ مندھی ہے پریتم ہوتے پاس

ڈوبی ڈوبی ناڑی ساجن اُکھڑے اُکھڑے سواس
دُکھ نے لوٹی روپ جوانی چنتا کھا گئی ماس
واں آکاش پہ تارا ٹوٹا، یاں ٹوٹی ہے آس

ہونٹ پہ دم ہے آنکھ مندھی ہے پریتم ہوتے پاس

(۴)

کس سے پوچھوں کون بتاوے کہاں گئی چت چور

کوکو کوکو کوئل بولے جھم جھم ناچے مور!
پی پی، پی پی کرے پپیہا کاگ مچاوے شور!
بادل گرجے بجلی چمکے اور گھٹا گھنگھور!

کس سے پوچھوں کون بتاوے کہاں گئی چت چور

(۵)

تجھ بن ساجن روتے روتے بیت گئے دو سال

تجھ بن ساجن جیون کیا ہے دُکھ بپتا جنجال!
تجھ بن جوبن روکھا پھیکا بھیگے بھیگے بال!

تجھ بن نظریں کھوئی کھوئی اُلجھے اُلجھے بال
تجھ بن ساجن روتے روتے بیت گئے دو سال

حیاتِ دو، روزہ

اپنی دو روزہ زندگانی پر! کچھ تو اے کاش اختیار بھی ہو!
کچھ تو ہو اعتمادِ ہستی پر! کچھ تو جینے کا اعتبار بھی ہو!
کچھ تو دنیا میں جی بہل جائے! کچھ تو کم دل کا انتشار بھی ہو!
جس نے جکڑے ہیں روح و جسم بہم! کچھ تو وہ رشتہ استوار بھی ہو!
جان کو موت سے اماں مل جائے!
مرہمِ سوزشِ نہاں مل جائے!

اُسے تنویر کہتے ہیں....

وہ جس کے نرم ہونٹوں پر رسیلے گیت رہتے ہیں
وہ جس کی مدبھری آنکھوں سے دھارے مے کے بہتے ہیں
وہ جس کے تیرِ مژگاں کی کسک منظور سہتے ہیں
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

وہ جس کے کاکلِ پیچاں میں زہری ناگ پلتے ہیں
وہ جس کے مست جلوے نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں
وہ جس کی بزم میں داغِ دلِ ناشاد جلتے ہیں
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

جو میرے شعر کے پردے میں چھُپکر مُسکراتی ہے
جو دل کی بیکراں گہرائیوں کو جگمگاتی ہے
جو غنچوں کی چٹک کے ساز پر مدمات گاتی ہے
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

دھنک بن کر جبینِ آسماں پر جو کہ تنتی ہے!
سمٹ کر جو شفق کا جلوۂ گلپوش بنتی ہے!
ضیائے حسن جس کے نقرئی جلووں سے چھنتی ہے!
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

وُہ پیکر حوریوں کا کیف زا انداز ہے جس میں
وہ بربطِ خلد کی مہکی ہوئی آواز ہے جس میں!
وہ غنچۂ لالہ و نسرین و گل کا ناز ہے جس میں!
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

وہی چینِ جبیں جس کا خطِ تقدیر ہو جائے
نگہ جس کی کتابِ شوق کی تفسیر ہو جائے
جو خوابِ نوجوانی کی حسیں تعبیر ہو جائے
اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

نظر جادُو کرے جس کی، ادا مسحُور کر ڈالے
محبّت کے سُرور سرمدی سے چوُر کر ڈالے
جو اِس مخمُور دِل کو اَور بھی مخمُور کر ڈالے

اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

جو چشمِ ماہ و انجم کو فروغِ حسن دیتی ہے!
شبوں کو چاندنی سے جو ردائے نور لیتی ہے!
ہوا اک سیلِ نغمہ بن کے جس کی ناؤ کھیتی ہے!

اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

سہانے قہقہے جس کے لبوں پر جھومنے آئیں
تبسّم کے شگوفے جس آنکھیں چومنے آئیں
خنک جھونکے چمن میں جس کی خاطر گھومنے آئیں

اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

وہ جس کے حُسن کے جلوے سراسر نور کی دُنیا
وہ جس کی آنکھ کہ شعلے جلالِ طور کی دُنیا
وہ جس کی زلف کے حلقے دلِ منظور کی دُنیا

اُسے تنویر کہتے ہیں۔ اُسے تنویر کہتے ہیں!

غزل!!

اُن کی آنکھیں بجلیاں برسا گئیں! رُوح پر تنویر بنکر چھا گئیں!
آرزُوئے دید یا شوقِ وصال کون بولا آگئیں وُہ آگئیں!
ضبط کا دعوے غلط یکسر غلط نام میرا سُن لیا شرما گئیں!
کر رہا تھا میں تغافل کا گلہ آنکھوں آنکھوں میں مجھے جھٹلا گئیں!
شوق تھا جن کو نمودِ حُسن کا میری چشمِ شوق سے گھبرا گئیں!
تجھ سُی کی آنکھوں نے اَبدل! بات چیت تو نے کیا سمجھا وہ کیا سمجھا گئیں!
صحنِ گلشن بن گیا ہے لالہ زار دیکھ کر کس کی نظر شرما گئیں!
آپ کا احساں حدودِ کائنات حلقۂ دامِ سخن میں آگئیں

شعر کے گلہائے تر میں نے چُنے
وہ نسیمِ صُبح بنکر آ گئیں!

کب آئینگے؟

کہا تھا کس نے مرے کان میں وہ آتے ہیں؟

یقیں نہیں مرے ظُلمت کدہ میں آئیں۔ ندیم
نہیں نہیں ابھی ممکن نہیں یہ لطفِ عمیم
وُہ آرہے ہیں تو آنے میں اِتنی عجلت کیا!
ہوئی ہے بال بنانے سے ان کو فرصت کیا!
ابھی تو ایک رمق جان تن میں باقی ہے!
ابھی تو تھوڑی سی گرمی بدن میں باقی ہے!
ابھی تو جانبِ در لگ رہی ہے میری نگاہ!
ابھی تو کروٹیں لیتی ہے دل میں اُن کی چاہ!
تھکی نہیں ہے ابھی آنکھ راستہ تکتے،
ابھی وہ آ نہیں سکتے وہ آ نہیں سکتے،

وہ آ ہی جائیں گے جب اُکھڑی سانس کا چکّر!
بنے گا شعلۂ جوّالہ ہیر کے ہونٹوں پر!
چراغِ زلیست کی لَو جبکہ تھر تھرائے گی!
ہوائے مَوت کے جھونکوں سے نیند آئے گی!
نہ دے سکینگے مرے ہونٹ اُن کو دِل کا پیام
نہ جھک کے پلکیں مری کر سکیں گی اُن کو سلام
ضرور آئیں گے اُس دم ضرور آئینگے

مُفلس کا شباب

مُسکرا دیتا ہے یوں گھُٹ گھُٹ کے جذباتِ لطیف
چادرِ افلاس میں لپٹا ہُوا رنگیں شباب
جس طرح اُٹھ اُٹھ کے سیلِ تیرگیِ وقتِ سحر
کانپتی، ڈرتی، جھپکتی سی شعاعِ آفتاب

اختر اور جگنو

[آج سے بہت عرصہ پہلے اُستاذ محترم علامہ کیفی دہلوی نے ایک موقعہ پر، اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ کہ مثنوی کے اجزاء مختلف بحروں میں ہوں۔ اس نظم میں اُسی رعائت سے فایدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اجتہاد کا دعوےٰ نہیں تتبّع ہے۔]

اختر

میں نورِ فلک ہوں تو نورِ زمیں تُو!، بہت مختلف مجھ سے جگنو نہیں تُو!،
چمک تجھ سے پیدا چمک مجھ سے پیدا ترے پَر سے میری جبیں سے ہویدا
ترا کام جلنا مرا کام جلنا!، ہمارا ہے آغاز و انجام جلنا!
فضا کو شعاعوں سے معمور کرنا شبِ تار کی ظُلمتیں دُور کرنا!

مرا نور تابندہ افلاک ہے!
تجلّی تری خطّۂ خاک ہے!

جُگنو

تو نورِ طرب ہے میں غم کی نوا! تو خاموش فطرت میں بانگِ درا!
تری زندگانی سراپائے ناز، مری زندگی حاصلِ سوز و ساز
تو اوجِ فلک پر ضیا کا اسیر! میں گلشن کی پُرنم فضا کا اسیر
تو نا آشنائے رموزِ حیات
عیاں مجھ پہ رازِ حیات و ممات

غزل

خوشی اک بار ہے قلبِ حزیں پر! کہ ہے موقوف اُن کی ہاں نہیں پر
اڑایا دل ادا نے کب کیونکر؟ یہ تہمت اور اک پردہ نشیں پر
کدو میں مے نہیں ہے چاندنی ہے گماں مہتاب کا ہے ساتگیں پر
نگاہوں میں نہیں جچتی خدائی! خدایا پڑ چکیں یہ کس حسیں پر
ہی چشمِ تماشا خود تماشا!
ہوئی غش کس کے اندازِ حسیں پر!

سرگوشیاں!

کس لئے توڑے ہیں تو نے بربطِ رنگیں کے تار؟
نغمہ زن تھا روحِ موسیقی میں غم کا انتشار
پہروں رہتا تھا دلِ پُر درد وقفِ اضطرار
نرم تانوں سے فزوں ہوتا تھا دل کا خلفشار
اس لئے توڑے ہیں مَیں نے بربطِ رنگیں کے تار

کس لئے گُل کر دیا تو نے چراغِ آستاں؟
اس کی لو تھی باعثِ جانسوزئ پروانگاں!
اس کے شعلوں پر لپکتا تھا ہجومِ عاشقاں!
آرزوئے وصل اڑتی تھی یہاں بنکر دُھواں!
اس لئے گُل کر دیا مَیں نے چراغِ آستاں!

کس لئے تیری جوانی کھو چکی ہے آب و تاب ؟

بسکہ ٹھوکر کھائے جنوں کی وادیوں میں پیچ و تاب !

کر چکی ہے راکھ میرے گُل کو نارِ اضطراب !

بن کے آنسو بہ چکا ہے آنکھ سے خونِ شباب !

اس لئے میری جوانی کھو چکی ہے آب و تاب !

کس لئے تیری اداؤں میں نہیں ذوقِ نمو ؟

اب کہاں باقی جمالِ دلنشیں کی آبرو ؟

اب کہاں باقی جہانِ دل میں شوقِ جستجو ؟

کور بین و کور باطن ہے نگاہِ آرزو !

اس لئے میری اداؤں میں نہیں ذوقِ نمو !

آمدِ بہار

وہ سُونے سُونے اداس جنگل!
تمام تکمیلِ یاس جنگل!
نہ پھن اٹھاتے تھے ناگ اُن میں
نہ پنچھیوں کے تھے راگ اُن میں
نہ بوئے گُل تھی نہ صوتِ نالہ!
لگی تھی پت جھڑ سے آگ اُن میں
فسردہ ساماں فسردہ منظر!
اُداس جنگل اُداس جنگل!

وہ سُوکھے سُوکھے خموش جنگل
خزاں کے حلقہ بگوش جنگل
فلک کے ہاتھوں اُجڑ چکے تھے
زمیں میں غیرت سے گڑ چکے تھے
عذارِ گُل تھا نہ زلفِ سنبل!
نقوش سارے بگڑ چکے تھے
وہ تھے تہی دامنی پہ نازاں!
خموش جنگل خموش جنگل!

ہُوئے ہیں پھر اب جوان جنگل!

بہارِ خنداں کی جان جنگل!

وہ تیرہ قسمت کو رو چُکے ہیں! خزاں کی گودی میں سو چُکے ہیں

فیوضِ شبنم کی خنکیوں سے! غبارِ دامن کو دھو چُکے ہیں

خوشی سے پھُولے نہیں سمانے

جوان جنگل، جوان جنگل!

پردیس میں پیاں کی یاد

اس طرح پردیس میں بچھڑے ہوئے پنچھی کی یاد

دل کے ہر گوشہ میں بھر دیتی ہے حسرت کا گداز

جس طرح میخوار کوئی توڑ کر جام و سبو،

سُن کے ساون کی حسیں بوندوں کی صوتِ دلنواز

ہم تم دونوں جھولا جھولیں!

کرودھ کپٹ سنسار کا بھولیں!
ہم تم دونوں جھولا جھولیں!

کالے کالے بادل چھائے! ناگن بن بن کر لہرائے
گرجے چمکے برسے ٹپکے آوارہ افلاک پہ بھٹکے
بجلی کی آکاش پہ کڑکیں! دِل سینوں میں جس سے دھڑکیں
کیسی رُت برکھا کی سہانی! وہ کیا چھاجوں برسا پانی
اَیسے میں تو خوشی منائیں! پیت کی بل کر پینگ بڑھائیں

کرودھ کپٹ سنسار کا بھولیں
ہم تم دونو جھولا جھولیں!

حوروں کو اک چکمہ دے کر! چوری زلفوں کے لٹ لے کر
مہر سے کچھ نورانی کرنیں! زرد گلابی دھانی کرنیں!
تاروں سے موتی کی لڑیاں! دنیا سے عشرت کی گھڑیاں!

اِن میں پریم کے پھول پروکر! شبنم کے پانی سے دھوکر!
ایک انوکھی پینگ بنائیں! اس کو ملکر خوب چڑھائیں!

کرودھ کپٹ سنسار کا بھولیں
ہم تم دونوں جھولا جھولیں

بیتی جائے عمر یافانی! اڑتا جائے روپ جوانی!
منجھدھارا میں جیون نیّا! کون بنے اب اس کا کھوّیا!
موجیں اٹھتی ہیں لہرا کر، ناگن بن کر پھن پھیلا کر،
مُنہ کھولے گھڑیال ہیں لاکھوں، اک جیون جنجال ہیں لاکھوں
الفت کے پتوار بنائیں! اپنی نیّا پار لگائیں!

کرودھ کپٹ سنسار کا بھُولیں
ہم تم دونوں جھولا جھُولیں!

دنیا میں دھن دولت جھوٹی، نام نمود اَور عظمت جھوٹی
مایا مال خزانے جھوٹے عشرت کے افسانے جھوٹے
اپنے اَور پرائے جھوٹے سچّے اَور جھٹلائے جھوٹے
سچّی پریت کی رِیت نیاری سچّی پریت پہ جیون واری

سیتجی پریت کے گُن ہم گائیں!   اس کی شوبھا اور بڑھائیں

کرودھ کپٹ سنسار کا بھولیں!

ہم تم دونوں جھولا جھولیں!

مُشاھدہ

موج مے بن کر فلک پر چھا گیا ابرِ بہار

اُس کا دامن چیر کر نکلی ہے بگلوں کی قطار

نیند سے بیدار ہو کر جس طرح وقتِ سحر!

تو جُدا کرتی ہے بالوں سے حسیں کلیوں کا ہار

غزل!

اُدھر جلووں کی مشقِ برق افشانی نہیں جاتی
اِدھر تابِ نظر کی طُور سامانی نہیں جاتی!

کرم کر باندھ دے تارِ نظر سے اِن کا شیرازہ
مرے اَوراقِ ہستی کی پریشانی نہیں جاتی!

ستاروں کی طرح دامن پہ میرے جگمگاتے ہیں
نظر سے گر کے بھی اشکوں کی تابانی نہیں جاتی!

مجھے توبہ کو کہتا ہے مگر توبہ سے اے زاہد!
پشیمانی تو جاتی ہے پریشانی نہیں جاتی!

دکھا لایا ہُوں آنکھوں کو تجمّلِ بزمِ انجم کا!
تری محفل میں لیکن اُن کی حیرانی نہیں جاتی!

تہ و بالا نظامِ ہر دو عالم کر چکی لیکن!
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی!

یہ میری پھُوٹی قسمت کا نوشتہ ہی نہ ہو یارب!
شکستہ خط میں ہے تحریر پہچانی نہیں جاتی!

شعاعیں چیر کر چلمن کے پردے پھوٹی پڑتی ہیں
حجابوں میں بھی اِن جلووں کی عُریانی نہیں جاتی!

ہزاروں حسرت و ارماں کے گُل بوٹے لگاتا ہوں!
مگر منظورؔ میرے گھر کی ویرانی نہیں جاتی!

خدارا نہ روک!

جگر میں ٹیس ہے اور دِل بھی ہے اُداس ندیم
رہا ہوں دردکشِ انتظار برسوں سے!
چڑھا ہے عشق کا سر کو خمار برسوں سے!
میں اب نہ ٹھیروں گا۔ جاتا ہوں اس کے پاس ندیم

مری نگاہوں میں غم کی جھلک ابھی تک ہے
وہ ہلکا ہلکا جو سینے میں درد رہتا ہے
کریدنے سے نگاہوں کے پھوٹ بہتا ہے
جو تیر کھایا تھا اس کی کسک ابھی تک ہے

شرابِ دید سے اب تشنگی بجھانے دے
بہا کے اشک گذارا ہے میں نے راتوں کو!

میں تیری بات کو مانوں کہ دل کی باتوں کو ؟
نہ روک مجھ کو خدارا نہ روک جانے دے

مرے ندیم! وہ آنسو بہانے جاتا ہوں!
کہ شمعِ بزمِ محبّت سے جن کو پایا تھا!
جبینِ چرخ سے جن کو مَیں توڑ لایا تھا!
وُہ اپنے شعر کے موتی لٹانے جاتا ہُوں!

گاؤں کا ٹیلہ

وہ جو اک ٹیلہ ہے اپنے گاؤں سے سمتِ جنوب!
حاشیے ہیں جس کے دامن کے ٹکی ہے سبز دوب!

جس کی گودی میں مچلتی ہے خوشی سے دھوپ چھاؤں
چومتی ہے اک ہمالہ زادی آکر جس کے پاؤں

جس کا ہر نظارۂ خوش رنگ صد جنّت بدوش
جسکے جھرنوں کی صدائے دلنشیں جنّت بگوش!

جس کا ہر اک ذرہ خاکِ طُور سے تابندہ تر!
جس کی ہر بنیاد عمرِ خضر سے پائندہ تر!

جس کی سطوت سے پہاڑوں کی جبیں جھکتی ہُوئی
بادلوں کی سانس جس کے سامنے رُکتی ہوئی

بدلیاں کرتی ہیں موتی جس کے قدموں پر نثار
ڈالتی ہیں لاکے گردن میں حسیں بوندوں کے ہار

شب کو پُر ہے جس کا دامن خندۂ مہتاب سے
دِن کو سُورج کی شعاعوں کی طلائے ناب سے

جھولیوں میں پھُول لاتی ہے گھٹا برسات کی!
خلعتِ نَو لیکے آتی ہے گھٹا برسات کی!

آستاں پر سیمگوں چادر بچھا دیتا ہے چاند!
آب دے کر مرمریں قُبّہ بنا دیتا ہے چاند!

رات کی خاموشیوں میں دل میں جب چبھتی ہے پھانس
ڈوبتی ہے درد کی شدّت سے جب سینے میں سانس

جَورِ استبداد سے ہوتا ہے جب دِل پاش پاش
چیرتی ہے جب مری چھاتی کو آہوں کی خراش

لوٹتی ہے چین جب معصوم رُوحوں کی پُکار!
مانگتی ہے خوں بہا مظلُوم رُوحوں کی پکار
دو گھڑی آلام سے آزاد رہنے کیلئے
پُرسکوں تنہائیوں میں شعر کہنے کے لئے
گاؤں سے اُکتا کے اس ٹیلے پہ چڑھ جاتا ہوں میں
جنّتِ نظّارہ سے آنکھوں کو گرماتا ہوں میں!
دیکھتا ہُوں سبزۂ نَورس کو لہراتے ہوئے
کاکُلِ سنبل کو لاتعداد بل کھاتے ہوُئے!
دیکھتا ہوں میں صبا کو منہ گلوں کا چومتے
ٹہنیوں کو رقص کرتے پتّیوں کو جھُومتے!
اَور اُن میں زُلف بکھرائے ہوئے فطرت کی حوُر
خنکیاں آنکھوں میں بھر دیتی ہے اَور دِل میں سرُور
منکشف ہوتے ہیں میرے دل پہ اسرارِ حیات
مجُھ پہ فطرت کھول دیتی ہے رموزِ کائنات
حوُرِ فطرت کے لبوں سے پھول چُنتا ہوں مَیں!
شعر کے قالب میں اُن کو ڈھالتا جاتا ہوں مَیں!

ندی کنارے گاگر لے کر

کیف کی بارش آنکھوں کے میخانے سے برسائے
قدم قدم پر پھول کی ڈالی بن کر لچکا کھائے
آنکھ کا جادو. نیند کی دیوی کا جوبن شرمائے
من کا بھونرا جوبن رس کو دیکھ دیکھ للچائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

موجوں کے آئینہ کو وہ چھب سُندر دِکھلائے،
شیش محل میں طور کا جلوہ بن بن کر تھرّائے،
چندرماں جوں لہروں کے گہوارہ میں لہرائے،
آپ ہی اپنی دیکھ کے صورت شرم سے سمٹی جائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

چاند کی کرنوں سے چھوڑی ہے فطرت نے مہتابی!
ڈورے لال شفق کی لہریں دونو نین شرابی!

رخساروں سے جلوے پھوٹیں سُرخ سفید گلابی!
جلووں کی تابانی آنکھیں سُورج کی جھپکائے
ندی کنارے گاگرلے کر جل بھرنے کو آئے

دنیا پر اک سکتہ طاری حیرانی حیرانی!
من موہنی متوالی آنکھیں مستانی مستانی!
کیفیّت سے چُور جوانی دیوانی دیوانی!
جل داتا کے منہ میں پانی دیکھ جسے بھر آئے
ندی کنارے گاگرلے کر جل بھرنے کو آئے

مدھ ماتی مدہوش جوانی جوں بادل کی رات!
گدرا جوبن نکھری صُورت البیلی گات!
لب پر مدّھم دھیمی دھیمی سمٹی سہمی بات!
ان باتوں سے کاش وہ مدرا کے ساغر چھلکائے
ندی کنارے گاگرلے کر جل بھرنے کو آئے

تن پر لرزہ نورجبیں پر خوشبُودار ہوائیں!
ساڑی میں ہلکی سی جنبش اور گیسو لہرائیں!

موجیں اور سب پنچھی مل کر گیت خوشی کے گائیں

آہ یہ منظر واہ یہ منظر جنّت کو شرمائے!
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے!

پانی کو نورانی ہاتھوں سے گاگر میں ڈالے!
ٹھوڑی سے گستاخ وہ پلّو ساری کا سنبھالے!
گاگر بھر کر غور سے چاروں جانب دیکھے بھالے!
مُنہ سے بولے "گاگر بھاری بھگون کون اٹھائے"
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

میں گاگر کو ہاتھ لگا کر سارا نیر بہا دوں!
چرنوں میں آنکھوں کے بادل سے آنسو برسا دوں!
اپنی پیت کا آنکھوں آنکھوں میں سندیس سنا دوں
پریم کتھا کو سُن کر میری اس کا جی گھبرائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

آ شیریں نغمات کے من سے پریم نگر کو بھر دوں!
خامہ سے مدرا ٹپکا کر میں ساگر کو بھر دوں!

تو یہ میرا کاسہ بھر دے میں گاگر کو بھر دوں

جیون اپنا بھینٹ چڑھا دوں گر اک جام پلائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

پریت ہے شیریں پریت ہے کومل جوں ندی کا پانی
سورج کی کرنوں کا زیور تاروں کی تابانی!
پریم نگر کا راجہ ہوں میں تو کہلائے، رانی!

میرا تن من دھن سب تیرا، تو میری ہو جائے
ندی کنارے گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے

ایک مستِ ناز کو گھر سے نکلتے دیکھکر!

اس طرح بہکے ہوئے نکلے حریمِ ناز سے

جس طرح نکلے نفیری سے کوئی مستانہ راگ
جس طرح گھونگٹ کے پٹ سے جھانک لیں زُلفوں کے ناگ
لڑکھڑا کر جس طرح گلشن سے آجائے نسیم!
گل کے سینے سے پرافشاں جس طرح نکلے شمیم!
جس طرح قطرہ گرے بادل کا دامن چھوڑ کر!
یا اُڑے بلبل قفس کی تیلیوں کو توڑ کر!
جسطرح بہہ جائے مینا سے شرابِ لالہ رنگ
جھوم کر اُٹھے کوئی جیسے جوانی کی امنگ
جسطرح شبنم گلوں کا پیرہن دھو کر اُٹھے!
یا شباب اِک خوابِ شیریں سے سحر سو کر اُٹھے!
شعر بن کر جس طرح بہتے ہیں افکارِ جمیل!

سر اٹھائے موج میں جیسے حبابِ سلسبیل
چاند کے عارض سے کرنیں ٹوٹتی ہیں جس طرح
سرخیاں نورِ شفق سے پھوٹتی ہیں جس طرح!
سُن کے اچھا گیت دنیا جھومتی ہے جس طرح!
اُن کے ایوانوں میں عشرت گھومتی ہے جسطرح!
اس طرح بہکے ہوئے نکلے حریمِ ناز سے

کیفیت!

دیکھ کر اُن مے فشاں آنکھوں کا مستانہ خمار
اس طرح مخمور ہو جاتی ہیں دل کی دھڑکنیں!
سُن کے جیسے بین کی کھوئی ہوئی سی راگنی!
کیفیت سے پھن اٹھا کر جھومتی ہیں ناگنیں!

خالد بن ولیدؓ

نازشِ احرار، فخرِ قوم، خالد بن ولید! — جس کو سونپی تھی خدا نے کامیابی کی کلید،

جس کی شمشیرِ فنا در جام تھی باطل کی موت! — صبح تھی ایمان پرور، شام تھی باطل کی موت

جس کی چشمِ غیض سے دامانِ باطل تار تار، — جس کی نوکِ نیزہ ظلمت کے جگر کے وار پار،

جس کی دستار و کُلہ پر تاجِ قیصر کا گماں!، — تارِ خرقہ پر شعاعِ شاہِ خاور کا گماں!

جس کی ٹوٹی سی زرہ پر جان و دل سو تھے فدا — جوہرِ خونِ رگِ فولاد، انجم کی ضیا

جس کا سادہ پیرہن زرّیں قباؤں کا جواب — نورِ ایماں، مہرِ گردوں کی شعاعوں کا جواب

جس کے رخشِ عزم و استقلال کا ہر ایک گام — بڑھ کے دنیا رزم کے میداں میں نصرت کا پیام

کوندتی تھی جس کے بازو کی چمکتی سی سناں! — قیصر و کسریٰ کے سر پر بن کے برقِ ناگہاں

تابعِ فرماں تھا جس کے حق پرستوں کا گروہ — سرفروشوں، روزہ داروں، فاقہ مستوں کا گروہ

منضبط، بیباک اور باحوصلہ تھی جسکی فوج! — اک نہ رکنے والی بڑھتی پھیلتی دریا کی موج

خندہ زن تھا نورِ وحدت تابشِ شمشیر میں! — اور لرزتا جوشِ دل اسکی ہر اک تقریر میں

صورِ اسرافیل باطل کیلئے گھوڑے کی ٹاپ — شورشِ صد حشر گوشِ کفر میں قدموں کی چاپ

غلغلہ تھا قوتِ لشکر شکن کا تا بہ گنگ ، موم ہو کر آتشِ ہیبت سے بہ جاتا تھا سنگ !

گردنِ نخوت اڑا دیتا تھا جو اک وار میں ! موت کی چنگاریاں تھیں تیغِ جوہر دار میں !

جس کے ڈر سے کانپتی تھی بزمِ عشرت کی ضیا سسکیاں بھرتی تھی ایوانِ تعیش کی ہوا !

ظلم و استبداد ڈر سے ہچکیاں لیتا ہوا بے بسی کے پانیوں میں ناؤ کو کھیتا ہوا ،

جسکے آگے جھک گئی تھیں گردنیں اکڑی ہوئی ! قیصریت سرنگوں زنجیر میں جکڑی ہوئی

برق بنکر اس کی جب تیغِ فضا لہرا گئی اک پھریری کائناتِ جسم و جاں میں آ گئی

سر پہ گر کر آہنی جوشن کے حلقے توڑ کر پھر میاں میں آ گئی کشتوں کے پشتے چھوڑ کر

جو گرج کر موت بن کر دشمنوں پر چھا گیا ! جو بسا اوقات پوری فوج سے ٹکرا گیا !

جس نے ہر میداں میں رکھی قوتِ مسلم کی لاج جس کی سطوت نے لیا کسریٰ و قیصر سے خراج !

جس نے زندہ کر دیا فرمانِ ربِّ پاک کو ! کر دیا محوِ تحیر دیدۂ افلاک کو !

جس نے دنیا میں نبیؐ کی بات کو پورا کیا ! ہادئ برحق کے ارشادات کو پورا کیا !

خالدِ فردوس منزل! آ کہ پھر ہے بے قرار
کفر کے جانکش کچوکوں سے بساطِ روزگار

غزل!

کچھ بوندیوں کے ساز پہ گا اور چلی جا !
منظورؔ کی اک چیز سُنا اور چلی جا!

کیا جانئے کس چیز کی تشنہ ہیں یہ آنکھیں !
کچھ ان کو نگاہوں سے پلا اور چلی جا !

دل بھولتا جاتا ہے پھر آدابِ کلیمی !
اس شوخ کو آداب سکھا اور چلی جا !

میں اسلئے روٹھا ہوں کہ مننے میں مزا ہے
اک بار محبّت سے منا اور چلی جا!

ڈر ہے نہ کہیں کھائے نظر چاند کی اس کو
گستاخ سے جوبن کو بچا اور چلی جا!

کیا شوخ نگاہی سے تجھے گھور رہی ہے.
نرگس کو ذرا آنکھ دکھا اور چلی جا!

کسطرح فضاؤں میں تڑپ جاتی ہے بجلی؟
ہنس ہنس کے یہ اعجاز دکھا اور چلی جا !

آپہلی کرن بن کے تو خورشیدِ سحر کی !
سوتی ہوئی کلیوں کو جگا اور چلی جا !

تاروں کی چمک، چاند کی ضو، اوس کی خنکی !
بن کر مری نظروں میں سما اور چلی جا!

ہنستے ہیں ترے حسن کی معصوم ضیا پر !
تاروں کے تبسّم کو اڑا اور چلی جا!

جسطرح صبا ٹوٹی سی محراب سے گذرے
غم خانۂ منظور میں آ اور چلی جا !

شبِ تاریک میں

شبِ تاریک میں جب لیٹتا ہوں۔ تا کہ سو جاؤں
سکوں پرور بنیدِ خواب سے سرشار ہو جاؤں
تو دُنیا کے مصائب داستاں گو بن کے آتے ہیں!
زبانِ حال سے وہ قصّہ ہائے غم سُناتے ہیں!
سناتے ہیں اسیرانِ قفس کی مجھ کو رُوداد یں!
مرے کانوں میں اکثر گونجتی ہیں جن کی فریادیں
سناتے ہیں مجھے آکر وُہ دُکھڑے بے نواؤں کے
مشقّت کھینچنے والوں کے آفت آشناؤں کے،
بچھونا خاک کا ہے خاک کا جن کا سرہانہ ہے
میسّر جن شب کو اور نہ دن کو آب و دانہ ہے
وہ جن کے قلبۂ افلاس پر وحشت برستی ہے
وُہ جن کی آنکھ اک نانِ جویں کو بھی ترستی ہے

وہ جن کی انگلیوں اور بازوؤں سے خون رستا ہے
وہ جن کا دانۂ دل آسیائے غم میں پستا ہے
یتیموں کے لبوں پر کس طرح فریاد آتی ہے
جب ان کو راحتِ آغوشِ مادر یاد آتی ہے
غم تنہائی سے گھبرا کے کیسے خوں روتی ہیں؟
یتیموں کی نگاہیں کسطرح موتی پروتی ہیں؟
جہاں میں کسطرح غفلت کا بادل چھائے جاتا ہے
مرے کانوں میں کوئی چپکے چپکے کہہ سناتا ہے
غبارِ دود جب تحلیل ہوتا ہے فضاؤں میں
بلائیں تیرتی ہیں رات کی بھیگی ہواؤں میں
مری چشمِ تصور دیکھتی ہے صاف تقدیریں
عیاں ہوتی ہیں مجھ پر قسمتِ واژوں کی تحریریں
سبق آموز ہوتی ہے کتابِ زندگی مجھکو!
مزا دیتی ہے درد و رنج و غم کی چاشنی مجھکو!
نظر آتی ہے مجھ کو انبساط و یاس کی دنیا!

غرور و خواجگی کی عشرت و افلاس کی دُنیا!
اِدھر غم کی نوا شورِ طرب میں کھوئی جاتی ہے!
اُدھر کرب و بلا سے آہ بن کر لب پہ آتی ہے!
اِدھر اہلِ دوَل وادِ نشاط و عیش دیتے ہیں!
اُدھر شامت کے مارے دامنِ حق تھام لیتے ہیں!
اِدھر غفلت زدہ مستِ مئے پندار ہوتے ہیں
اُدھر رکھ کر جبینیں خاک پر مِسکین روتے ہیں
اِدھر آٹھوں پہر عیش و طرب کے پھول کھلتے ہیں
اُدھر آہنگِ غم سے سازِ دل کے تار ہلتے ہیں!
سماں یہ دیکھ کر سینے سے اِک ہیجان اٹھتا ہے
پیازی آنسوؤں کا بے طرح طوفان اٹھتا ہے
مرے ہاتھوں سے دامانِ صبُوری چھوٹ جاتا ہے
مرا دل ٹوٹ جاتا ہے مرا دِل ٹوٹ جاتا ہے

جہاں سارا گرفتارِ طلسمِ خواب ہوتا ہے!
تو کوئی رات کی تنہائیوں میں خوُب روتا ہے!

الفت مری مہکتی کلی ہے گلاب کی!

(رابرٹ برنز کی ایک نظم کا اردو ترجمہ)

الفت مری مہکتی کلی ہے گلاب کی! — جو شاخِ انبساط پہ ہو ادھ کھلی ہوئی
الفت مری حسین تڑپ ہے رباب کی! — جس میں سرور و سکر کی مے ہو، ملی ہوئی

جتنی حسیں ہے تو مری مستِ مئے شباب — اُتنا فریب خوردہ ہوں تیری نگاہ کا!
جب تک سمندروں کو جلا دے نہ آفتاب — دم ہے یقیں کہ بھرتا رہوں گا میں چاہ کا!

جب تک سمندروں کو جلا دے نہ آفتاب — جب تک پہاڑ مہر کی کرنوں سے جل نہ جائے
بھرتا رہوں گا دم ترا مستِ مئے شباب — جب تک نگہ سے نور بھجا ول سے بل نہ جائے

حافظ خدا ترا۔ مری ایمان آرزو!   اب میں دیارِ غیر میں بخت آزماؤں گا!
منزل ہزار سال کی گو ہوگی رُو برُو!   آ کر میں تیری راہ میں آنکھیں بچھاؤں گا!

غزل!

ردِ تقدیر کی تدبیر کئے جاتے ہیں!   چاک ہوتا ہے گریباں تو سئے جاتے ہیں
کونسی اُن کو دلائی دمِ رخصت اُمید!   کس تمنّا پہ گنہگار جئے جاتے ہیں
پیرِ گردوں کی صُراحی میں ہیں تلخاب کے گھونٹ   اور کس لطف سے میخوار پئے جاتے ہیں

اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنے گی آخر!
اسی اُمید پہ منظور جئے جاتے ہیں!

یادیں!

یہ بستی دیکھکر!!!

یہ بستی دیکھ کر آنے لگی ہیں کچھ حسیں یادیں
یہی بستی ہے وابستہ ہیں جس سے دلنشیں یادیں

یہ یادیں ساتھ کچھ بھولی ہوئی باتوں کو لے آئیں
مرے عہدِ جنوں کی مضطرب راتوں کو لے آئیں

دھندلکے سی مرے کھوئے ہوئے خوابوں کو لائی ہیں
سکوں کی گود میں سوئے ہوئے خوابوں کو لائی ہیں

فسانہ بنکے آئی ہیں کہانی بن کے آئی ہیں!
مرا گذرا ہوا عہدِ جوانی بن کے آئی ہیں

یہ یادیں رُوح کے مدفن میں دفنائے ہوئے خاکے
مٹے سے نقش ہیں اور چند دھندلائے ہوئے خاکے

یہ یادیں اس پہ شاہد ہیں کہ تنویرِ وفا بھی ہے
مرے ماضی کی تاریکی میں مدہم سی ضیا بھی ہے

ضیا افروز ہیں یوں ذہن کے باریک پردوں پر!
کہ جیسے روشنی کے داغ ہوں تاریک پردوں پر

یہی بستی ہے آنکھوں میں کھُبے جاتے ہیں گھر جس کے
نگاہوں سے بہت مانوس ہیں دیوار و در جسکے

ہر اک ذرّے سے جسکے چھن رہی ہے نور اور مستی!
یہی بستی ہے جانِ آرزو و تنویر کی بستی!

شکستہ پُل نظر آتا ہے جو اس خشک نالے پر
یہیں میری تمنّاؤں کے طائر نے نکالے پر

یہیں پہلے پہل دیکھا تھا میں نے بے نقاب اُنکو
یہیں میری نگاہوں نے کیا تھا انتخاب اُن کو

سماں دیکھا قیامت کا انہیں سنسان گلیوں میں
انہیں مخمور راہوں پر انہیں حیران گلیوں میں

انہیں مسرور پیڑوں میں اسی مسحُور گلشن میں!
سمائیں رُوح کی بنیا بیاں پہلو کی دھڑکن میں!

وہی پامال رستے ہیں وہی پگڈنڈیاں دیکھو!
قیامت ہیں کسی کے نقش پا کی شوخیاں دیکھو

وُہی آموں کا جھرمٹ ہے جہاں چھپ چھپ کے ملتے تھے
نگاہیں چار ہوتی تھیں دلوں کے تار ہلتے تھے

وہی پر کیف منظر ہیں. وہی مدہوش سائے ہیں
وہی شیشم ہیں میں نے جن کے نیچے گیت گائے ہیں

یہ منظر خلد بن جاتے اگر تنویر آجاتی!
اس البم میں وہ حسن و ناز کی تصویر آجاتی!

اُن سے رخصت ہوتے وقت

لب فسردہ، چشم گریاں، دِل میں حسرت کا وفُور
جا رہا ہُوں اَور نہیں معلوم پھر ملنا ہے کب؟
دل کے تاروں کو ہم آہنگی سے پھر ملنا ہے کب؟
جا رہا ہوں کیف زار رنگینیوں سے دُور، دُور

دل میں غم نے چٹکیاں لیں بے کلی ہونے لگی!
لے چلی پردیس کو فکرِ معیشت لے چلی!
ڈال کر پھندا مری گردن میں قسمت لے چلی!
بے بسی مایوسیوں کی گود میں رونے لگی!

جا رہا ہوں اس طرح تیرے وزیر آباد سے!
دِل میں تیری یاد کی ٹیسوں کو بہلاتا ہُوا!
سوزشِ دِل سے جنوں کی نبض گرماتا ہُوا!
آسماں کا سینہ پھٹتا ہے مری فریاد سے!

دِل دھڑکتا ہے فِضا کا محشرِ جذبات سے
خون کا چشمہ اُبلتا ہے مرے نغمات سے

غزل!

پھُول پر بھونرے ہیں اُور شمع پہ پروانے بھی! قیدئ عشق ہیں فرزانے بھی دیوانے بھی
شعلہ آشامو! لو آئی وُہ نوید عشرت ! ابر کے ساتھ بہے آتے ہیں میخانے بھی
عشق میں سوزِ جنوں خیز نہیں ہے ورنہ، وادئ طور بھی ہے نجد کے ویرانے بھی
طرفہ معجون ہیں اوراقِ کتابِ ہستی ! غم کی روداد بھی ہے عیش کے افسانے بھی

مطلعِ صبحِ حقیقت ہے مری شامِ مجاز
میرے پہلو میں حرم بھی ہے صنم خانے بھی!

پیتم ہے انجان

کم سن الھڑ بھولا بھالا ـــــــــــ دُنیا سے انداز نرالا!
غفلت کا ماتا متوالا،
پیتم ہے انجان!
ابھی تک
پیتم ہے انجان!
پیتم ہے انجان!
دل ہے کرنا شاد نہ کردے ـــــــــــ حسرت سے آباد نہ کردے
جیون کو برباد نہ کردے
ہردے کا ایمان!
نہ دیکھوں
ہردے کا ایمان!
پیتم ہے انجان!

جی میں بس کر بھول نہ جائے ———— آنکھ رلا کر آنکھ چرائے

آشا لوٹے خون رلائے!

من مندر ویران

نہ کر دے

من مندر ویران

ہیتیم ہے انجان

شکتی کے بل ٹوٹ نہ جائیں ———— خون کی ندیاں پھوٹ نہ جائیں

دل کی نبضیں چھوٹ نہ جائیں

دکھیا جیو کا مان!

نہ ٹوٹے

دکھیا جیو کا مان

ہیتیم ہے انجان

ساجن کیسے پیت کو جانے! پریم کی وہ کیا ریت کو جانے

کیا بیری اور مبیت کو جانے

ناواقف، نادان!

ہے ہیتیم

ناواقف ، نادان!
پیتم ہے انجان!

ساجن کو منظور بھی ہے، ——— اچھوں کا دستور بھی ہے
ہاں چشمِ بد دُور بھی ہے!
جیون ، ہو ویران!
کسی کا،

جیون ، ہو ویران
پیتم ہے انجان

تقاضا!

عیاں ہے اُن کی چشمِ نیم وا سے!
کھلی گل کی گرہ لطفِ صبا سے!
تو غمزہ میں سمٹ جاتی ہیں حیا ہیں!
تقاضا ہے یہ شوخی کا ادا سے

گُم شدہ ستارہ

میں ایک ذرۂ ناچیز ہوں مگر بے باک
فلک پہ پھینکی ہے میں نے کمندِ اِستدراک!

میں اس میں قید ستاروں کو کرنے والا ہوں
متاعِ نور سے دامن کو بھرنے والا ہوں!

کہ ان میں ایک ستارے کی آرزو مجھکو!
بنائے رکھتی ہے سرگرمِ جستجو مجھ کو!

زمیں کا چاند تھا۔ اس خاکداں کا نور تھا وہ
کلیمِ دل کیلئے جلوہ گاہِ طور تھا وہ!

فروغِ حسن پہ گردوں بھی رشک کھاتا تھا۔
کہ اس کے آگے ستاروں کو ماند پاتا تھا،

حسد کی آگ کے شعلے مدام جلتے تھے
اور آسمان کی چھاتی پہ مونگ دلتے تھے

تمام رات ستاروں کی کانپتے کٹتی!
سسکتے۔ آنکھ کو جھپکاتے، ہانپتے کٹتی!

یہ اُس سے آنکھ ملاتے ہوئے جھجکتے تھے
یہ اُسکے سامنے آتے ہوئے جھجکتے تھے

یہ روز روز کا خدشہ مٹا یا گردوں نے!
اُسے بھی ایک ستارہ بنایا گردوں نے

میں اب تلاش میں اس کی بھٹکتا رہتا ہوں
تمام رات ستاروں کو تکتا رہتا ہوں

بھارت کے نام پر

زردی سی کھنڈ رہی ہے گُل لالہ فام پر
حسرت ہے غم طراز مرے دشت و بام پر
اُٹھّو نظر جما کے شہادت کے جام پر
کردو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

پیارا وطن تمہارا ہوں سُن لو فغاں مری
مُضمر ہے لب کی سسکیوں میں داستاں مری
دیتی ہیں کڑکڑا کے صدا ہڈّیاں مری
کردو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

بس وُہ عرُوسِ ہند ہوں جس کے سہاگ سے
اچھّی وہ بیوگی جو جلاتی ہے آگ سے
اُجڑی ہوئی ہوں اپنے نصیبوں کی لاگ سے
کردو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

گم ہو کے ہچکیوں میں صدا کوہسار کی
بنکر خروشِ درد نوا آبشار کی
کہتی ہیں ہل کے شوکتیں اُجڑے دیار کی
کر دو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

دشت و جبل پہ چھا کے ترنّم ہواؤں کا!
سَو پیچ و تاب کھا کے ترنّم ہواؤں کا
کہتا ہے گنگنا کے ترنّم ہواؤں کا
کر دو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

اک جوئے نغمہ بن کے بہارِ سخن کی مَوج
دوشِ صبا پہ جھوم کے بوئے چمن کی مَوج
کہتی ہے یوں پکار کے گنگ و جمن کی مَوج
کر دو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

غیروں کی چشمِ زخم کا کھایا ہُوا وطن
عالم کی دھمکیوں کا ستایا ہُوا وطن
کہتا ہے یوں جفا کا رُلایا ہُوا وطن
کر دو نثار جان کو بھارت کے نام پر!

اے آنکھوں کی تنویر!...

اے آنکھوں کی تنویر مرے ہردے کی رانی
چرنوں میں خجالت سے ترے بھرتے ہیں پانی
شیریں کا مدھر روپ زلیخا کی جوانی
رقصاں ہے اشاروں پہ ترے عالم فانی!
اے آنکھوں کی تنویر مرے ہردے کی رانی!

وہ ہنستی ہوئی لطف و مدارات کی باتیں!
وہ چاند کی کرنوں میں ملاقات کی باتیں!
پھر آج مجھے کہنی ہیں اُس رات کی باتیں!
جس رات کی اب یاد ہے اور اشک فشانی
جس رات کو تو بھول گئی ھردے کی رانی!

خواب آفریں جھونکوں میں وہ دریا کا کنارا
بل کھائے ہوئے پگھلی ہوئی چاندی کی دھارا

آباد ہے تخیّل میں وہ مست نظارا!
انگشت بدنداں ہو جسے دیکھ کے مانی!
کیا یاد ہے کچھ تجھ کو بھی اے ہردے کی رانی!

وہ ہلکی سی رُت اَور وہ کاتک کا مہینہ
وہ کرنوں کا آکاش پہ تنتا ہُوا زینہ!
اِک رَو میں وہ ہم دونوں کے جیون کا سفینہ
وہ تاروں بھری رات وہ دریا کی روانی!
منظور تھا اَور تو تھی مرے ہردے کی رانی!

شاخوں سے اُلجھتے ہوئے سرمست ترانے
خوشبوئے تخیّل سے مہکتے ہوئے گانے
سب تجھ کو سناتے تھے محبّت کے فسانے
موجوں کی زباں پر تھی مری پریم کہانی!
نغمات میں تو کھوئی تھی اے ہردے کی رانی!
جب سانس کی خوشبو سے معطّر تھیں ہوائیں
کانوں میں کہیں خُلد سے آتی تھیں صدائیں

جب بڑھ کے مرے شوق نے لیں تیری بلائیں
باہم تھیں مری آرزو اور تیری جوانی!
اس جنّتِ نظّارہ میں اے ہردے کی رانی!

گلہائے طرب خندہ نے برسائے تھے جس میں
قامت نے قیامت کے چلن پائے تھے جس میں
جلووں نے ترے شعلے سے بھڑکائے تھے جس میں
لوٹا دے مجھے پیار کی وہ رات سُہانی!
اتنی سی تمنّا ہے مرے ہردے کی رانی!

نینوں کے مدھر بان نے تڑپایا ہے دل کو
نخوت نے تری یاد ہے ٹھکرایا ہے دل کو
سَو طرح سے میں نے بھی تو سمجھایا ہے دِل کو
اس درد کے رسیا نے مری ایک نہ مانی
تُو ہی اسے سمجھا دے اے ہردے کی رانی

دلبر تو ہے اے کاش تو دِلدار بھی ہوتی
اے کاش تجھے حرمتِ اقرار بھی ہوتی

اے کاش مجھے جرأتِ اظہار بھی ہوتی
اس بات کی جو ہو گئی اب بات پرانی!
جو بن گئی افسانہ اب اے ہردے کی رانی!

آ چشمِ تجسّس کے تقاضوں کو مٹا دوں!
آ چیر کے دِل اپنا تجھے داغ دِکھا دوں!
کہنے کی نئی طرز ہے چاہے تو سنا دوں!
رودادِ الم اپنی ہیں اشکوں کی زبانی!
اے آنکھوں کی تنویر مرے ہردے کی رانی!

تو روٹھی ہے تا چند منائے نہ بنے گی!
تا چند مجھے دِل کی سنائے نہ بنے گی!
تا چند کوئی بات بنائے نہ بنے گی!
تا چند رہے گی یہ مری سوختہ جانی!
تڑپائے گی تا چند مجھے ہردے کی رانی!

افکار کے گل خونِ تمنّا میں بھگو کر!
آنکھوں کے چھلکتے ہوئے ساغر میں ڈبو کر!

یہ دُرِّ ثمین تارِ رگِ جاں میں پرو کر!

لایا ہوں تیری نذر کو اک سلکِ مُعانی!

اے آنکھوں کی تنویر مرے ہردے کی رانی!

وہ ترچھی نظر

جس طرح جنگل کے سنّاٹوں کو چونکاتی ہے ریل

جس طرح ہوتی ہے تاروں سے فضا زیر و زبر

اس طرح ہاں اس طرح میرا سکونِ زندگی!

کر گئی برباد وہ مے پاش ترچھی سی نظر!

اہتمام!

دل میں خلش تھی روحِ تمنا تھی بیقرار
ہونٹوں پہ جان آئی تھی ان کا تھا انتظار

وہ آرہے تھے اور یہاں تھا یہ اہتمام
آنکھوں میں خونِ دل سے جلایا چراغِ شام

ہر رہگذر پہ شوق کے دیپک جلادیے
ہر راہ میں نیاز کے سجدے بچھا دیے

ہر اک گلی کے موڑ پہ روشن کیے چراغ!
خنداں تھے جن میں سینۂ پُر آرزو کے داغ

کٹیا کی گرد جوششِ گریہ سے دھل گئی
اشکوں کی پونجی آنکھ کے کانٹے میں تُل گئی

جی گھٹ کے دم جو رکنے لگا خوب رو دیے
ان کے گلے کیواسطے موتی پرو دیے

آنکھوں کے نور سے کیے دیوار و در سپید!
محراب در پہ لکھا لہو سے خوش آمدید

موسیقی مستعار لی چنگ و رباب سے!
مانگے کرن کے پھول رگِ ماہتاب سے

دھڑکن کا نغمہ ہچکیوں کا ساز تھا وہ ساز!
جن کی خموش نالوں سے آہن بھی ہو گداز

وہ آئے اور مجھ سے رہے کچھ کھچے کھچے
اخگر ہوا کے نم سے ہوں جیسے بجھے بجھے

آئیں گھٹائیں خلد کی مے سے بھری ہوئی
لیکن نہ میری شاخِ تمنا ہری ہوئی!

میری طرف مڑی نہ نظر التفات کی! دل کی مرے سنی نہ کوئی دل کی بات کی!
آنکھوں میں بیرخی سی نگاہیں جھکی جھکی! بے ربط تھی جو بات کی رُوکھی رُکی رُکی!
دل میں غضب کا قہر رہا برہمی رہی! کیا مجھ سے اہتمام میں یارب کمی رہی
یہ برہمی اَور اُس کا سبب میں سمجھ گیا! بُشرے سے جو عیاں ہے وہ سب میں سمجھ گیا

مقہُور اِس لئے ہوں میں اُن کی جناب میں!
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

دولتِ عرفاں

شہ پاک بندے بڑی شان والے!
مصلّا و تسبیح و قرآن والے!
انہیں دولتِ نورِ عرفاں میسّر
گدا ہیں مگر ساز و سامان والے!

غزل!

تو اور اب تک رہینِ جلوۂ بام!
اٹھ کہ عرشِ بریں ہے تیرا مقام!

بہ گئے اشک چھل گیا سینہ!
لب پہ آنے لگا تھا کس کا نام

شورشیں دل کی ہو چکیں خاموش،
لب پہ نالہ نہ سسکیوں کا خرام

موت کی نیند چار سُو طاری
نَے کی آواز ہے نہ گردشِ جام!

جانے آئے نہ آئے اب تنویر!
زندگانی کی ہو چلی ہے شام

در پہ اب تک لگی ہوئی ہے نظر!
دِل میں اب تک ہے اِک تجسّسِ خام

زندگی سانس کا تسلسل ہے!
اب نہ میری سحر ہے اور نہ شام

جل چکی شمع اور صحبتِ شب!
کیا مزے کی تھی ہو چکی ہے تمام

دُور تاریکیوں کے سائے ہیں!
کاروانِ عدم ہے محوِ خرام!

عمر کا بھر چکا ہے پیمانہ!
قِصّہ کوتہ۔ ہُوا ہے قِصّہ تمام!

کوئے تنویر کو جاتے وقت!

لے چلی پھر مجھ کو وحشت کوچۂ تنویر میں
پھر مرے سینے میں لی کروٹ مرے جذبات نے
پھر مرے ہونٹوں کو گرمایا حسیں نغمات نے
پھر مری بیتابیاں جھلکیں مری تحریر میں!

آنکھ کے گلخن میں پھر آنسو مرے اخگر بنے
بجلیاں سی دامنِ آلام میں پلنے لگیں
یعنی شمعیں تھیں کہ بادِ تُند میں جلنے لگیں
دشتِ وحشت کے بگولے پاؤں کا چکّر بنے

عقل بے احساس ہو تو عشق کا اس میں قصور
جاؤنگا اور عقل کو رکھ دُونگا میں بالائے طاق
لے چلیگا تا بمنزلِ عشق کا بیخود براق
جاؤنگا تنویر کے کوچے میں جاؤں گا ضرور!

سامنے دریا ہو پربت ہو کہ ہو تاریک غار
پھاند جاؤں گا میں آنکھیں موند کر بے اختیار

غزل!

جب سے اداشناس دلِ رازداں کا ہوں !
مسّاح گویا وسعتِ کون و مکاں کا ہوں!

جوہر خودی کا سجدوں سے مٹّی میں مل چکا
اب ایک داغ سنگِ درِ آستاں کا ہوں!

مذکور جس میں ہے ترا افسانۂ جمیل!
میں بھی تو ایک باب اُسی داستاں کا ہوں!

آتی ہے میری خاکِ پریشاں سے بوئے دوست
مارا ہوا بھی ہوں تو کسی مہرباں کا ہوں!

افشاں ہیں اپنی مجھ کو وہ چُن لے خدا کرے
ٹوٹا ہوا ستارہ کسی آسماں کا ہوں!

کردی ہیں مجھ پہ منکشف آفاق کی حدیں
منّت پذیر دل کے غمِ بیکراں کا ہوں!

اے رازداں نہ تجھ کو اگر ناگوار ہو!
کہہ دوں بہت ستایا ہوا رازداں کا ہوں!

گریۂ فطرت!

فطرتِ رازداں کی آنکھوں سے آخرِ شب جو اشک بہتے ہیں
اوس بن کر چمن کے پھولوں سے ماجرائے حیات کہتے ہیں!

زندگی کیا ہے غم کا افسانہ
شورشِ دل کی اِک کہانی ہے
سوزِ پروانگاں فروغِ شمع
حاصلِ دردِ نوجوانی ہے
پل میں آئی، چڑھی، اُتر بھی گئی!
تیز رو موجِ زندگانی ہے
مختصر تر نگہ کی چشمک ہے
خضر کی عمرِ جاودانی ہے

زندگی کی سرشتِ فانی پر! آسماں زار زار روتا ہے!
عمر کی برق وش روانی پر! گل کا منہ آنسوؤں سے دھوتا ہے

غم کی اٹکی ہے پھانس پہلو میں!
خونِ دل کی نمود آنسو میں!

احسانِ دوناں

پہاڑوں کو جلا کر خاک کرنا
ردائے آسماں کو چاک کرنا
حصارِ سنگِ خارا توڑ دینا!
فصیلِ آہنی کو پھوڑ دینا
تنورِ آتشیں میں کود پڑنا،
فضا کے شعلۂ سوزاں سے لڑنا
اُٹھا کر پیٹھ پر بارِ گراں کو
نکلنا سیرِ اکنافِ جہاں کو
یہ سب کچھ ہے مرے امکاں کے اندر
مگر اک شے سے عاری ہوں سراسر

کہ اک پاجی کمینہ خصلت انساں
کرے مجھ کو قتیلِ تیغِ احساں

نالہ و اشک

دِل کے تاروں سے تھرتھراتا ہُوا   خشک ہونٹوں پہ نغمۂ فریاد
آنکھ میں اشک مُسکراتا ہُوا   دِل کو ان کی دلا رہا ہے یاد

نالہ کیا ہے ہوا کی موجوں پر!
اُن کی پازیب کی حسیں جھنکار
یا کسی بنسری کی شیریں لے
چاندنی رات میں ندی کے پار
اشک کیا ہے نگہ کا آئینہ
جس میں رقصاں جمالِ روئے نگار
شاخ سے جیسے جھڑ رہے ہوں پھول
آسماں سے برس رہی ہو پھوار

نالہ و اشک رازِ الفت ہیں   حاصلِ سوز و سازِ الفت ہیں
دل میں جو نارِ عشق رہتی ہے
نالہ و اشک بن کے بہتی ہے

آنکھیں!

لوٹتا ہے مطمئن ہو کر دلِ پُر اضطرار! تیری آنکھوں کے نہاں خانہ سی جلووں کی بہار
تیری آنکھیں فتنہ ساماں سرکش و آوارہ ہیں جن میں خوابیدہ قیامت ہے یہ وہ گہوارہ ہیں۔
سُرمگیں آنکھوں میں دل کی شورشیں آسودہ خواب بحرِ ساکن جس کی تہ میں ہے خروش و اضطراب
آنکھ کی گہرائیوں میں ڈوب جانے دے مجھے ہوں جنوں پرور فریبِ عشق کھانے دے مجھے

غرق ہو کر اس حبابِ بحرِ طوفاں زار میں!
آب موتی سے سوا ہوگی مرے اشعار میں!

پھولوں کی شہزادی

کسی کی وادیٔ حسن و طرب میں جی کو بہلا کر! — گلوں کے کان میں بادِ صبا چپکے سے کہتی ہے
میں اس صحنِ چمن سے اپنی جھولی بھر کے لائی ہوں — جہاں موجِ ہوا پر نکہت آوارہ رہتی ہے
جہاں لہریں وفورِ شوق سے آپس میں ملتی ہیں! — جہاں ندی ہرے اشجار کے سائے میں بہتی ہے
جہاں کوئل کی کوکو گونج اٹھتی ہے فضاؤں میں — سماعت نغمۂ قمری کی نازک چوٹ سہتی ہے
جہاں آموں کے کنجوں میں ہے اک ایوانِ فردوسی! — وہ کاخِ نور پھولوں کی جہاں شہزادی رہتی ہے

صبا کو راس آئی ہے فضا یوں اُسکے گلشن کی!
کہ پھولوں سے یہ رنگیں داستاں ہر روز کہتی ہے

گفتگوئے خاموش

ہات میرا جب کہ مس ہوتا ہے ان کے ہات سے

بیکلی ہوتی ہے دِل کو بات کرنے کے لئے — نقش سب بیتاب ہوتے ہیں اُبھرنے کے لئے
خامشی کا قفل لگتا ہے مگر آواز پر! — ڈوب کر ہوتے ہیں گم نغمے دہانِ ساز پر
تالے پڑتے ہیں لبوں پر اور زباں کھُلتی نہیں — چیز کانٹے میں تکلّم کے کوئی تُلتی نہیں!
نطق رہ جاتا ہے عاجز دل کی کہہ سکتا نہیں — جذب دل اس آب جو کیسا نہ بہہ سکتا نہیں!
ہونٹ سِل جاتے ہیں اور جب گُنگ ہوتی ہے زباں — خامشی کو پھر عطا ہوتا ہے اندازِ بیاں!
سنسناہٹ برق کی اک رو پہ ہو ہو کر سوار — جھن جھنا کر آتی جاتی ہے بدن کے وار پار
یوں رگوں کے تار لیجاتے ہیں اصواتِ حسیں! — نشتر گہ سے جسطرح ہوں نشر نغماتِ حسیں!
ہاتھ کا نازک دباؤ انگلیوں کا ارتعاش! — دل کے دل پر برملا کرتا ہے سارے راز فاش

ہاتھ میں ہوں ہاتھ اور بیٹھے ہوں جب ہم رُوبرو
خامشی سے دل کئے جاتے ہیں پہروں گفتگو!

نقوشِ فانی

شاداب بہاروں میں دریا کے کنارے پر!
پرکیف نظاروں میں! رسّی کے سہارے پر!

جامن سے بندھی دیکھی
اک نرم و معطّر بیل
جگ میں نہ سُنی دیکھی
اس بیل سے بڑھ کر بیل!

پتّوں میں طراوت تھی غنچوں میں چٹک پَیدا!
شاخوں میں لطافت تھی پھولوں سے مہک پَیدا

دیدار سے آنکھوں کو!
سیراب میں کرتا تھا!
اَور توڑ کے پھُولوں کو!
رومال میں بھرتا تھا!

جب دیدۂ گریاں سے بادل کے بہا پانی !
اور جوشش طوفاں سے دریا میں چڑھا پانی !

سب سازِ حسیں اس کے
طوفاں نے مٹا ڈالے
سب نقش و نگیں اس کے
اک پل میں بہا ڈالے

طوفانِ بلا پرور ! بہتا ہے بہاتا ہے
ہر روز نئے منظر ! دُنیا کو دکھاتا ہے

ہاں بھول نہ یہ دم بھر
جب موت کی طغیانی
گرداب فنا بن کر !
پھیلائے گی ویرانی

اک روز نہاں ہونگے یہ نقش و نگار اپنے
کیا کہئیے کہاں ہونگے یہ چشم و عذار اپنے

بے صوت و صدا ہوگا

ہستی کا رباب آخر
مٹّی میں فنا ہو گا!
یہ حسن و شباب آخر

داستانِ حیات

کل یہ کہتا تھا رازدانِ حیات
مختصر سی ہے داستانِ حیات
طفلی خندہ شباب خود بینی!
پیری لاریب نوحہ خوانِ حیات!

بول مُسافِر بول

(۱)

دھوپ کا مارا، لو کا جھلسا، جھوڑا ڈانواں ڈول
سر پر تیرے پاپ کی گٹھڑی جھوٹا تیرا بول
آ جیون کو سورگ بنا دوں من کی گھنڈی کھول
تیرے من کی اِچھّا کیا ہے. بول مسافر بول
سونے کی ہے ڈوری میری رُوپے کا ہے ڈول
بول مسافر بول

(۲)

ماتھے بندی، نینن جادو، منہ میں سُندر گیت
میں ہوں اس پنگھٹ کی رانی نام ہے میرا "پیت"
جو دِل کی یاں بازی ہارا اُس کی جگ میں جیت
پیاسا ہے تو چھاگل بھر دوں لا دوں مصری گھول

سونے کی ہے ڈوری میری رُوپے کا ہے ڈول

بول مسافر بول

(۳)

آرے مسافر پریم نگر میں، میں تیرے بلہاری

جوبن میرا اَنیا نَویلا آنکھ بھری متواری

سندرتا کے روپ میں ساجن بستے ہیں گردھاری

سُندرتا کے اَن ودھ موتی مت ماٹی میں رول!

سونے کی ہے ڈوری میری رُوپے کا ہے ڈول!

بول مسافر بول!

(۴)

بیٹھ مسافر کھول کمر کو سُن برہہ کے راگ!

آن بجھالے ٹھنڈے جل سے لوبھی جیو کی آگ!

پریم نگر کا اِک پٹ کعبہ اِک پٹ ہے پریاگ!

میرے جل کی آشا ہے تو آکر یہ پٹ کھول!

سونے کی ہے ڈوری میری رُوپے کا ہے ڈول!

بول مسافر بول!

غزل!

ڈر ڈر کے قدم رکھتا ہے غم قلب و جگر میں
جاتا ہے اسے گویا کسی اُجڑے سے گھر میں

ارزاں ہیں بہت جلوے ترے میری نظر میں
تو تابشِ خورشید میں تو نورِ سحر میں!

کل تک تو نہ تھے میری نگاہوں میں بھی جچتے
کیوں آج لگے بننے خدا میری نظر میں!

بکھرائے ہوئے دوش پہ زلفوں کی شعاعیں
بیٹھا ہے کوئی حجلۂ سیمینِ قمر میں!

یہ خُلد بکف ہے تو وہ ہے دشت بداماں
دِل میں تیری تصویر ہے سودا ترا سر میں!

ہر نقش قدم مجھ کو اُبھرتا نظر آیا!
جلووں کا تلاطم تھا تری راہگذر میں!

پیکر میں ترے ڈھل کے بنا حسنِ مجسّم!
جس نور کا پرتو تھا شعاعوں میں شرر میں!

شبنم کی حسیں بوندوں کی بن بن کے تراوش
منظور وہ پھر آئے مرے دیدۂ تر میں

روتے ہیں دو نین!

روتے ہیں دو نین پیا بن روتے ہیں دو نین

رُت بدلی اَور سرسوں پھُولی

بین پگلی سب سُدھ بُدھ بھولی

رم جھم رم جھم میگھا برسے

جی للچائے درس کو ترسے

پھر پاپن نے من کو ہارا! پھر جمنا کی بنکر دھارا

روتے ہیں دو نین!

پیا بن

روتے ہیں دو نین!

روتے ہیں دو نین پیا بن روتے ہیں دو نین

بادل گرجے بجلی کڑکے

آگ برہہ کی من میں بھڑکے
کُوہو کُوہو کوئل بولے
کانپے گات جیارا ڈولے
چنتا کی ماری کو پل بھر   برہن دُکھیاری کو پل بھر
آوت ناہیں چین
پیا بن
روتے ہیں دو نین!

روتے ہیں دو نین   پیا بن   روتے ہیں دو نین
اُن کی ہنستے گاتے گذری
میری نیر بہاتے گذری
اُن کی کٹ گئی سوتے سوتے
میری کٹ گئی روتے روتے
اس کا کیا جو بیت گئی ہے   رین ہی تھی سو بیت گئی ہے
بیت گئی ہے رین

پیا بن
روتے ہیں دو نین!

روتے ہیں دو نین   پیا بن   روتے ہیں دو نین

مجھ نردوش کا دوش بتا دیں
کیوں روٹھے ہیں یہ سمجھا دیں
نالے چھاتی توڑ کے نکلے
یہ پنچھی پر جوڑ کے نکلے
پریتم آئیں بالم آئیں   آئیں اور آ کر سن جائیں
دکھیاری کے بین

پیا بن
روتے ہیں دو نین

لٹاتی چلی جا!

نظر بن کے دل میں سماتی چلی جا!
ہنساتی چلی جا رُلاتی چلی جا!
مثالِ صبا لڑکھڑاتی چلی جا!
کلی کی طرح مسکراتی چلی جا!

شرابِ محبّت پلاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

گھٹا کی جبیں پر وہ آیا پسینا!
وہ چھلکا ہے ساغر وہ چھلکی ہے مینا
لٹا دے مئے احمریں کا خزینا
کہ پینا ہے جینا کہ جینا ہے پینا

پلاتی چلی جا پلاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

خمارِ آفریناِ خمارِ آفرینا
سبو تیرا، پیمانہ تیرا، آبگینا
مِرا چھوڑ دے موجِ مَے میں سفینا
اِسے ڈگمگانے کا آئے قرینا

اِسے مَے کی رَو میں بہاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لُٹاتی چلی جا!

نہ ہو ان پہ مجھ کو ستاروں کا دھوکا
سحر کے دمکتے نظاروں کا دھوکا
مہِ نَو کے سیمیں عذاروں کا دھوکا
جھلکتے ہوئے نور پاروں کا دھوکا

نشانِ کفِ پا مِٹاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لُٹاتی چلی جا!

گئی رات کی کچھ دُعاؤں کو لے کر
سکوں بخش ٹھنڈی ہواؤں کو لے کر
ریاضِ جناں کی صداؤں کو لے کر

رباب جنوں کی نواؤں کو لے کر!

انہیں جانِ نغمہ بناتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

ہوا کی گرہ سے ہوں اعجاز پیدا
ہوں ہر شے میں مستی کے انداز پیدا
فضا میں ہو جس سے تگ و ناز پیدا
ستاروں کو ہو شوقِ پرواز پیدا

کوئی گیت ایسا سناتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

تری شوخیاں آزمانے کی خاطر!
ترے شوق کو گدگدانے کی خاطر!
سمجھ لے کہ تجھ کو چڑانے کی خاطر!
بنانے کی خاطر ستانے کی خاطر!

میں روٹھا ہوں تجھ سے منانی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

یہ آنکھیں کوئی شے چرا لے گئی تھیں!
یہ جُل دے کے اپنا بنا لے گئی تھیں!
فریبِ نظر سے لبھا لے گئی تھیں!
دھڑکتا ہُوا دِل اُڑا لے گئی تھیں!

یہ قرضہ ہے سر پر چُکاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لُٹاتی چلی جا!

تو بھُولی ہے سب کچھ مگر یاد ہو گا
گئے تھے سلمیٰ کے گھر یاد ہو گا
وہ پچھلے پہر کا سفر یاد ہو گا
بنا تھا میں جب راہبر یاد ہو گا

اِسی یاد سے دِل لبھاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لُٹاتی چلی جا!

جوانی کے خوابوں کی تعبیر بن جا
نگاہِ تمنّا کی تنویر بن جا
جبیں پر مقدّر کی تحریر بن جا

ہری مسکراتی سی تقدیر بن جا

انوکھے کرشمے دکھاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

یہ سویا نصیبہ ہے بیدار کر دے
یہ حرماں کی تربت ہے ہموار کر دے
یہ شاخِ تمنّا ہے بردار کر دے
یہ منظورؔ بیخود ہے ہشیار کر دے

اِسے ایک ٹھوکر لگاتی چلی جا!
جوانی کی مستی لٹاتی چلی جا!

مُلاقات

سوادِ شام کا بھیگا ہُوا چُپ چاپ منظر تھا ہوا خاموش موج آسودہ تھی آغوشِ ساحل میں
پِلادی تھی نبیذِ بیخودی پتّوں کو شبنم نے فسوں تھا کارفرما لیلئ فطرت کے محمل میں
تھکن سے اونگھتی جاتی تھی ہر شے مضمحل ہو کر مگر اِک محشرِ جذبات تھا منظور کے دِل میں
لبِ ساحل تھا میں ہاتھوں سے تھامے قلبِ مضطر کو

اُڑی جاتی تھی دیوی رات کی زلفوں کو بکھرائے فلک پر چاند خنداں تھا ستارے مُسکراتے تھے
مگر میرے سپہرِ عشق پر اُمّید کے انجم! نکل آتے تھے پل بھر جھلملا کر ڈوب جاتے تھے
میں تنہائی میں اس کوتاہیٔ قسمت پہ روتا تھا! مری پلکوں پہ آنسو سیل بن کر اُمڈے آتے تھے
سِکھا دی تھی خوئے ابرِ بہاراں دیدۂ تر کو!

اچانک اس فضائے منجمد میں انقلاب آیا، مجھے پازیب کی جھنکار سے چونکا دیا تُو نے
ہُوا فق رنگِ مہ تاروں کے منہ پر مُردنی چھائی! بڑھی موجِ رواں ذرّوں کا دِل گرما دیا تُو نے
دکھا کر مجھ کو یہ تاثیر اپنے جذبِ اُلفت کی! دِلِ بیتاب کے ہر تار کو لرزا دیا تُو نے
تری آنکھوں میں دیکھا میں نے رقصاں اشکِ احمر کو

ملی مجھ سے مگر ملنا تھا یہ ملنا قیامت کا ! گریباں میرا اپنے آنسوؤں سے دھو گئی عذرا
ابھی تک تھے جبینِ بندگی میں مضطرب سجدے ابھی تھی دل کی دل ہی میں کہ مجھ سے کھو گئی عذرا
اِدھر میری محبّت نے اُدھر تقدیر نے کھینچا ! ہوئی تقدیر غالب اَور رخصت ہو گئی عذرا
یہ کہہ کر "لو خدا حافظ ملیں گے روزِ محشر کو!"

گانے تو دو!

دوشِ فطرت پر دھوئیں کے ناگ لہرانے تو دو!
اُودے اُودے ابر کے ٹکڑوں کو گدرانے تو دو!
کیوں ابھی سے شیشہ و ساغر کھنکنے کی صدا
اُن کو ہلکی بوندیوں سے ساز پر گانے تو دو!

خواب سے بیدار ہو کر

سحر کا وقت ہے تنویر مُسکراتی ہے
فضا کو نورِ تبسّم سے جگمگاتی ہے

فغانِ نیم شبی ہیں جو مَیں نے گائے تھے
حسین لَے ہیں وہ اشعار گنگناتی ہے

نشیلی آنکھوں سے مستی کے پھُول برسا کر
عروسِ صبح کے جلووں کا مُنہ چڑاتی ہے

صبا کے ہاتھوں صبوحی کے جام پی پی کر
مثالِ نکہتِ مستانہ لڑکھڑاتی ہے

گلابی ساری سے چھنتا ہوا سا نورِ جمال!
شعاعِ مہر شفق میں سے جھلملاتی ہے

چلی ہے سیر کو اس آن بان سے جیسے
نسیم جوہی کے پھُولوں میں سرسراتی ہے

شرارِ حُسن سے گرما دیا رگوں میں لہو!
نظر سے شوق کے پہلو کو گدگداتی ہے

فضا میں حسن کی کرنوں سے نور برسا کر
ہوا میں شعلوں کا سیلِ رواں بہاتی ہے

طلائی چوڑیاں بجنے کی میٹھی نرم صدا
ہوا کے دھیمے سے جھونکوں تھرتھراتی ہے

حنائی پاؤں کے خلخال کی حسیں جھنکار   کہ اِک مغنّیّہ اُس پار گیت گاتی ہے
چلی ہے سیر کو بادِ بہار کی صُورت !   ندی کی لہروں کی مانند پیچ کھاتی ہے

اِدھر ہے تاک میں منظورِ سا خرابِ جنوں
اُدھر وہ شرم سے اپنا بدن چُراتی ہے

دِلرُبائی

شب کے سنّاٹوں میں دِل کو چھین لیتا ہے کوئی
مسکرا کر کھلکھلاتی چاندنی کے رُوپ میں !
کھینچتا ہے جس طرح اِنسان کو اپنی طرف !
سایۂ اشجار دِن کو چلچلاتی دُھوپ میں

چھوڑ دے چھوڑ کے جانیکا خیال!

یہ تری زلف کو بکھراتی ہوئی بادِ شمال!
یہ حسیں رات، یہ سبزہ، یہ گُلِ تر کا جمال!
ہو میسّر کہ نہ ہو پھر یہ فراغت یہ وصال!
چھوڑ دے آج کی شب چھوڑ کے جانے کا خیال!

دیکھنا وقتِ سحر رات کی شوکت کا مآل!
ٹوٹ جائیگا حسیں بکھرے ہوئے تارونکا جال!
آ گلے مل کہ ہے دنیا کی ہر اک شے کو زوال!
چھوڑ دے چھوڑ کے منظورؔ کو جانے کا خیال!

گو تمنّاؤں کو ہے رات یہ معراج کی رات!
ہے یہی سوچ کرے یا نہ کرے آج کی رات!
ناشکیبائی مری تیرے تلوّن سے سوال!
کیوں ترے دل میں ہے پردیس کو جانیکا خیال!

پھُول کی باس، ستاروں کی ضیا، دل کا گداز
اپنے عارض کی چمک، حسن کا تیکھا انداز
ساری دُنیا کی حسیں چیزوں کو پیمانے میں ڈال!

اَور پھر چھوڑ دے پردیس کو جانے کا خیال!

کون جانے یہ خوشی چرخ کو بھائے کہ نہ بھائے
یہ حسیں رات کبھی لَوٹ کے آئے کہ نہ آئے
اے مری حسنِ ادا! اَے مری فردوس جمال!

چھوڑ دے آج مجھے چھوڑ کے جانے کا خیال!

تو سبک سیر ہَے یہ ساتھ کہیں چھُوٹ نہ جائے
ہم کو باندھے ہے جو رشتہ وہ کہیں ٹوٹ نہ جائے
آ مِرے ساتھ نبھانے کی کوئی راہ نکال!

اَور ابھی چھوڑ دے پردیس کو جانے کا خیال!

میں ترے واسطے انوار کہیں سے لاؤں!
توڑ کر تارے ثریّا کی جبیں سے لاؤں!
پھُول کی ڈبیا سے خوشبوؤں کو لے آؤں نکال!

تو اگر چھوڑ دے پردیس کو جانے کا خیال!

آگ ہی آگ ہے جس میں، مَیں وہ شے لایا ہوں!
سوز میں ڈوبی ہوئی درد کی لَے لایا ہوں!
اِس میں کچھ ٹیسوں کے نغمے ہیں کچھ آہوں کا اُبال!
نذر کردوں تو اگر چھوڑ دے جانے کا خیال!

سانس گھُٹ جائے زمانے کی فضا راس نہ ہو!
ہو شبِ تار یہ دُنیا تو اگر پاس نہ ہو!
مرنا مشکل ہو مجھے اَور ہو جینا بھی وبال
تو اگر چھوڑ نہ دے چھوڑ کے جانے کا خیال!

اعجازِ تصوّر

کل رات کہ گردوں پہ تھے چھٹکے ہوئے تارے
انوار سے گلپوش تھے خاموش نظارے!

جگنو تھے کہ تھرّاتے تھے آغوشِ ہوا میں
یا نیل کے دریا میں تھے کچھ نور کے پارے

مشرق سے بڑھی آتی تھی مہتاب کی کشتی!
بط جیسے کوئی تیرتی ہو سینہ ابھارے

اٹھتا تھا ہر اک سمت سے نورانی دھواں سا!
ہر چار طرف چھُٹتے تھے سیمابی فوارے

مہتاب سے بڑھ بڑھ کے ترا دستِ حنائی!
کرتا تھا مجھے پیار سے بیباک اشارے

آتی تھیں مرے کانوں میں کچھ ایسی صدائیں!
جیسے کوئی پی پی مجھے کہہ کہہ کے پکارے

آوازیں، مچلتے ہوئے جذبات کا نغمہ
یا بج رہے تھے پانچویں سپتک میں دو تارے

کانوں سے سنی بات لگی چوٹ جگر پر!
ہر دے کے مرے تار لرزنے لگے سارے

اب عشق جنوں خیز ہوا عازمِ گردوں!
اُٹھّا کہ درِ حسن پہ کچھ سجدے گذارے

جذباتِ محبّت، مرے جذباتِ محبّت
تڑپے، کہ پہنچ جائیں ترے راج دوارے

حائل تھی مگر راہ میں اُف دُوریٔ منزل!
اِک بحرِ بلاخیز تھا غائب تھے کنارے

امواج کی لہروں کا تھا موّاج سمندر
اور پاس مرے ناؤ نہ کشتی نہ شکارے

تو جلوۂ مہتاب سے اے پیکرِ تنویر ! رہ رہ کے کئے جاتی تھی مدہوش اشارے
اس عالمِ حرماں میں کہ دل بیٹھ رہا تھا بیتاب ہوا جاتا تھا میں درد کے مارے
"لے چلتا ہوں میں" بول اٹھا مرغِ تخیّل جو اڑتا ہے جذبات کے شہپر کے سہارے
پھر زیبِ بدن میں نے کیا جامۂ تسلیم ! اور جسم سے ملبوسِ خودی میں نے اتارے
اور چڑھ کے تخیّل پہ اسے ایڑ بتا دی "چل مرغِ ہوا شوق مجھے پار اتارے"
لے پہنچا تخیّل مجھے اس بامِ طرب پر اڑتے ہیں جہاں نور کے خوش رنگ غبارے
گلتے ہیں جہاں چار پہر چاندی کے توڑے بہتے ہیں چپ و راست جہاں نور کے دھارے
اب میں تھا مرے سامنے تھی جلوہ گہِ حسن ! آغوش میں تھا چاند مری مٹھی میں تارے
اور تجھ کو انہیں خلد کے نظاروں میں دیکھا ! عارض کو ضیا تاب کئے بال سنوارے
کیا جانیئے کیا سحر وہاں پھونک دیا تھا لرزاں تھے تری دید سے گردوں کے ستارے
مشتاق نگاہوں سے تجھے دیکھ رہا تھا تجھ سے تھا خجل چودھویں کا چاند بھی پیارے
سچ پوچھیئے خود بھی تھی تو اک نور کی دنیا ! افشاں کا کہیں چاند کہیں مانگ کے تارے
ہونٹوں سے ترے جھڑتے تھے گلہائے تبسّم ! امرت کے تری باتوں سے بہہ جاتے تھے دھارے
قسّام سے اس پیکرِ رعنا کو ملی تھی ! تنویرِ مہ، بوئے گل، صوتِ ہزارے
عشوہ لبِ گویا تھا ادا محوِ تکلّم ! چتونوں میں چھپے بیٹھے تھے خاموش نظارے

اک کیف کا عالم لئے اٹھتی تھیں نگاہیں ! جھڑتے تھے ترے عارضِ گلگوں سے شرارے
اب آرزوئے دید تھی آسودۂ تکمیل ! اب بڑھ کے مرے شوق نے کچھ پاؤں پسارے
اب میری تمنّا نے تجھے گود میں بھینچا ! تو جھینپ گئی سُرخ ہوئی شرم کے مارے
اب تو مرے پہلو میں تھی اور عشرتِ کونین ! خنداں تھی بڑے ناز سے ہونٹوں پہ ہمارے
گردوں کی جبیں جھکتی تھی تعظیم کو میری اب میرے قدم چومتے تھے چاند ستارے
اب تاروں نے ہنس ہنس کے کرن پھول لٹائے گلہائے طرب سر سے مرے چاند نے وارے

۶

دم دے گیا تھا کیا مجھے اعجازِ تصوّر؟ دکھلائے تھے تخئیل نے کیا رنگ بنارے
جب آنکھ کھلی پھر وہی ہو حق کا تھا عالم ! کٹیا میں نظر آتا نہ تھا ہاتھ پسارے
خلوت کدۂ غم کی وہی سرد فضا تھی !
اب تو تھی نہ مہتاب نہ وہ مست نظارے

مری محبّت قبول کر لے!

لہو کے ہیں کچھ جگر میں قطرے اِنہیں خدارا قبول کر لے
تو اپنی چشمِ کرم سے کہہ دے یہ نذرِ اُلفت وصول کر لے
وفا میں مرنا وفا میں جینا یہ زندگی کا اصول کر لے
اگر سمجھتی ہے بھول اس کو تو بھول کر ہی یہ بھول کر لے

مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

جہاں کو ٹھکرا دیا ہے میں نے ترے لئے دلنواز عذرا
روا نہیں ہے مٹا بھی دے ما و تو کا یہ امتیاز عذرا
مری نگاہوں کی بے بسی کہہ رہی ہے سب دل کے راز عذرا
تجھے قسم اپنے ناز کی سُن لے اِلتجائے نیاز عذرا

مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

ترے لئے دلنواز عذرا میں جاں کی بازی لگا چکا ہوں!
نظر میں جب سے سمائی ہے تو وفا کے پردے اُٹھا چکا ہوں

تری نگاہوں کی عین زد میں نشیمن اپنا بنا چکا ہوں!
تری تمنّا میں روز و شب نارِ اشک پر گنگنا چکا ہوں!
مری محبّت قبول کر لے! مری محبت قبول کر لے!

جہاں کی ہر شے گریز پا ہے ہر ایک ساعت ہے آنی جانی
مگر محبت، کہ اس کے بس میں یہ ہے کہ ہو جائیں غیرِ فانی
تری جوانی مری تمنّا، مری تمنّا تری جوانی
مرے حریم سخن میں آجا، ملے تجھے عمرِ جاودانی
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

مری محبّت کی وادیوں کی فضا ہے کیا خوشگوار آجا
یہاں مرے داغہائے سینہ سے ہے نمودِ بہار آجا
یہاں مری چشمِ منتظر سے رواں ہیں کچھ آبشار آجا!
برس رہا ہے حسین نغموں سے کیف آگیں خمار آجا!
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

جو جلوہ افگن ہے چاند کی ضَو میں اَور تاروں کی روشنی میں
جو مضطرب ہے چمن چمن میں، جو منتشر ہے کلی کلی میں

جو نورافشاں ہے عارضِ گُل میں اُور شبنم کی آرسی میں
جھلک رہا ہے وہ حُسنِ مطلق مری محبّت کی سادگی میں
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

مری محبّت ہے والہانہ مری طبیعت ہے شاعرانہ
چمن کے گوشوں میں گاؤں گا سازِ برگ و گُل پر ترا ترانہ
لکھوں گا پھولوں کے پیرہن پر تری محبّت کا اِک فسانہ
مِٹا سکے گا نہ اِن نقوشِ وفا کو بھُولے سے بھی زمانہ
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

غم و الم کے تھپیڑے کیا شَے ہیں اُور طوفانِ یاس کیا ہے
اگر محبّت کا ہو سفینہ تو ڈوبنے کا ہراس کیا ہے
جہاں میں بے شک ہے قحطِ اُلفت مگر نوائے جاں اُداس کیا ہے
سوائے اِک پُرخلوص دِل کے ترے بھکاری کے پاس کیا ہے
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

یہ دِل یہ گِل کا حقیر ٹکڑا یہ جامِ جسم ہے جہاں نُما ہے
جسے کھلونا سمجھ رہی ہے! یہ محفلِ زیست کا دِیا ہے

اگرچہ اِس کی تجلّیوں سے چراغِ خورشید جل رہا ہے!
مگر اَے تنویرِ چشمِ عالم ترا ہی اِس دل کو آسرا ہے!
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

اَے وُہ کہ قائم وفارِ اُلفت ہے آج دُنیا میں تیرے دم سے
اَے وُہ کہ تو نے کیا شناسا مری محبّت کو سوزِ غم سے
اَے وہ کہ دھویا ہے چشمِ شاعر کو تو نے اشکِ رواں کی نم سے
صدائیں پیہم نکل رہی ہیں یہ نغمۂ دِل کے زیر و بم سے
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

ترے تجسّس میں کھو چکا ہوں نہ دِن ہے اپنا نہ رات اپنی
تری طلب ہے نجات اپنی، تری رضا کائنات اپنی!
گذر رہی ہے تری وفاؤں کے آسرے پر حیات اپنی!
یہی ہے منظور کی تمنّا رہے زمانے میں بات اپنی!
مری محبّت قبول کر لے! مری محبّت قبول کر لے!

غزل!

تبسّم کے گہر برسا رہے ہیں
یہ موتی پھول بنتے جا رہے ہیں

پیامی آ رہے ہیں جا رہے ہیں
وہ اِتنا کیوں کرم فرما رہے ہیں

بیں اپنا حالِ دل کہتا ہوں اُن سے!
اور آنسو ہیں کہ بہتے جا رہے ہیں

محبت میں یہ حالت ہو چکی ہے
میں اُن کو وہ مجھے سمجھا رہے ہیں

اِدھر طاری سکوتِ مرگ مجھ پر!
اُدھر وہ بے سبب گھبرا رہے ہیں

ہنسو غنچو! ستارو مُسکراؤ
مری آغوش میں وہ آ رہے ہیں

لبحا کر اور بہت مدّھم سُروں میں!
سُنا ہے میری غزلیں گا رہے ہیں

کہا منظورؔ کا احوال سُن کر!
سزا جرمِ وفا کی پا رہے ہیں!

پردیسی کا پریم سے

بلبل کے شیریں نغموں میں فطرت کا موسیقار بھی ہے!
اور بادِ سحر کی سرمستی سے رُوحِ چمن سرشار بھی ہے!
بلبل کے مست ترانے بھی کوئل کی بن میں کوک بھی ہے!
اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے سینے سے اُٹھتی ہُوک بھی ہے
چرواہے اب بھی وادی میں ہنس ہنس کر شور مچاتے ہیں
سبزہ میں بھیڑیں چرتی ہیں پیڑوں پر پنچھی گاتے ہیں
پانی کی موج گلستاں میں سبزہ کو کترتی ہے اب بھی!
سُنبل کی زلف ہواؤں کے شانہ سے سنورتی ہے اب بھی
وہ حُسن ہے اب تک پتّی میں وہ لوچ ہے اب تک ڈالی میں
مے ادس کی بھنورا پیتا ہے پھولوں کی نازک پیالی میں
وہ کوہ و دمن کے منظر بھی دریا کی مست خرامی بھی
کرنوں کا سیلِ نور بھی ہے موجوں کا رقص دوامی بھی!

گلشن میں اب بھی شاخوں پر ہر روز شگوفے کھلتے ہیں
مدہوش صبا کی موجوں سے اشجار کے پتّے ہلتے ہیں
خوشبوئیں دوب کے ریشوں میں اب بھی ہیں تیرے بالوں کی
گُلزار کی ہر شاداب کلی میں سُرخی پھول سے گالوں کی
یہ باغ و راغ کی سرد ہوا اے کاش مجھے بھی راس آتی!
اے کاش تو میرے پاس آتی! اے کاش تو میرے پاس آتی!

جب شام و سحر کے چکّر میں ہر سال بہاریں آتی تھیں
جب کالی گھٹا کے دامن میں بگلوں کی قطاریں آتی ہیں
جب کوئل کُو کُو کرتی ہے جب بوندا باندی ہوتی ہے
جب آم کا ٹپکا پڑتا ہے جب گھر گھر شادی ہوتی ہے
جب کُہر اخیمہ تنتا ہے جب سرد ہوائیں آتی ہیں!
جھولی میں موتی لاتی ہیں چاندی کا فرش بچھاتی ہیں!
دیوار و در پر فطرت کا جب ہاتھ سپیدی کرتا ہے!
دامانِ شفق میں نورِ سحر جب رنگ انوکھے بھرتا ہے!
جب ابر کے لکّے چھٹتے ہیں جب مہر کا رنگ بدلتا ہے

جب منہ پر رونق آتی ہے جب خون رگوں میں چلتا ہے
جب تازہ پتی شاخوں کے دامن میں جھولا جھولتی ہے
جب غنچے ہنس ہنس پڑتے ہیں کھیتوں میں سرسوں پھولتی ہے
جب ساون کی رت آتی ہے جب دنیا جل تھل ہوتی ہے
جب روپ انوپ نکھرتا ہے جب دل میں ہل چل ہوتی ہے
جب پیڑ میں پینگیں پڑتی ہیں جب سکھیاں مل کر گاتی ہیں
تاروں کی نور افشاں لڑیاں مہتاب کی یاد دلاتی ہیں

میں تیری دھن میں پھرتا ہوں میں یاد میں تیری گاتا ہوں!
میں وادی کے ہر گوشہ میں ہنسی کی تان اڑاتا ہوں!

تو گرچہ مجھ کو بھول گئی! میں بھولا نہیں ہوں، یاد ابھی!
وہ پیاری پیاری سندر صورت من میں ہے آباد ابھی!
آنکھوں میں رقصاں ہے اب تک وہ متوالا انداز ترا!
ہر سانس میں مضمر نور ترا ہر تارِ نفس ہمراز ترا!
میں تیری یاد میں مرتا ہوں تو میری یاد بھلا بیٹھی!
سب دیس سے ناطے توڑ دئے پردیس سے پیت لگا بیٹھی!

تو اپنے چمن کے پھولوں کی رنگین قبا کو بھول گئی!
بلبل کے میٹھے نغموں سے مسحور فضا کو بھول گئی
تو بھولی اپنی جنّت کے ان کیف بھرے گلزاروں کو!
ان جھیل کے لمبے سایوں کو ان سر بفلک دیواروں کو!
تو بھول گئی اُن سکھیوں کو جو تیرا ناز اُٹھاتی تھیں
جو تجھ کو جھومر میں لے کر تیّوں کی تال پہ گاتی تھیں
تو بھول گئی اُس پریمی کو جو گیت سنایا کرتا تھا!
وادی میں دلکش نغموں کی جو تان اُڑایا کرتا تھا!
تو بھول گئی ان پیاری پیاری چاند کی اُجلی راتوں کو!
تو بھول گئی اُن مست منوہر پریم کی میٹھی باتوں کو!
تو بھول گئی ان اُلفت کے مخمور سُہانے وقتوں کو!
للّٰہ کبھی لوٹا بھی دے اُن مست پُرانے وقتوں کو!

وہ دن محبّت کے لوٹ آئیں!

(۱)

وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں ——— وہ دِن محبّت کے لوٹ آئیں

وہی امنگیں وہی ترنگیں وہی سماں اپنے ساتھ لائیں
خوشی سے پھُولے نہ ہم سمائیں
بساطِ ہر دو جہاں پہ چھائیں
وہی محبّت بھرے ترانے ہمارے ہونٹوں کی لیں بلائیں!
وہ دِن محبّت کے لَوٹ آئیں!

(۲)

وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں! ——— وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں!

کہیں سے بھگوان کہیں سے لادے وہ اُجلے دن وہ سہانی راتیں!
وہ پیار کی دلنواز گھاتیں!!
وہ رُوح کی جانگداز باتیں!!

سُنیں مرے جی کا آ کے دُکھڑا مجھے وہ اپنی کتھا سُنائیں

وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں!

(۳)

وہ دِن محبّت کے لَوٹ آئیں! ——— وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں

جو آئیں ساجن تو ہم خوشی سے منائیں مِل مِل کر رنگ رلیاں

کِھلیں تبسّم کی تازہ کلیاں!

لبوں سے مِصری کی میٹھی ڈلیاں!

لٹائیں اَور خوب مسکرائیں ضیا سے معمُور ہوں فضائیں

وہ دن محبّت کے لَوٹ آئیں!

ایک یاد!

یاد ہوگا چاندنی کی اِک سُہانی رات کو!

پیار سے مَیں نے دبا رکھا تھا تیرے ہات کو!

گرچہ لب خاموش تھے اَور گو زبانیں بند تھیں!

پِھر بھی ہم کہہ سُن رہے تھے دِل کی اِک اِک بات کو!

غزل

لبِ بام آ کے بھی دیکھ لے کبھی مُسکرا کے بھی دیکھ لے!
یہ خزینۂ حسنِ مجاز کا سرِ راہ لُٹا کے بھی دیکھ لے

میرا دل ہے اس ننگ و ناز میں کہ بُلا لے خلوتِ ناز میں
جو حجاب ہے ابھی درمیاں وہ حجاب اُٹھا کے بھی دیکھ لے

یہ تمام شعلہ و نور ہے، یہ جوابِ جلوۂ طُور ہے
مرے دل کی بزم تو دیکھ لی سرِ طُور جا کے بھی دیکھ لے

یہ جو آ گیا تری راہ میں، جو کھٹک رہا ہے نگاہ میں!
یہ نشانِ سنگِ مزار ہے یہ نشاں مٹا کے بھی دیکھ لے

کبھی رنج دے کبھی شاد کر! کبھی بھول جا کبھی یاد کر!
نئے روز شاخِ مراد پر مری گُل کھلا کے بھی دیکھ لے

ترا پاسبان جمال ہے مرا تجھ سے ملنا مُحال ہے
مری کائنات لرز اُٹھے جو نظر بچا کے بھی دیکھ لے

تری برق پاش تجلّیاں کریں تابِ دید کا امتحاں!
مری بے بسی پہ ترس نہ کھا مجھے منہ دکھا کے بھی دیکھ لے

غمِ عشق میں تجھے مان لوں انہیں بُت بنائے تو جان لوں!
بڑی لے کے آیا ہے داستاں چل اِسے سُنا کے بھی دیکھ لے

مجھے مر کے مِٹنا ضرور کیوں؟ تجھے اِس پہ فخر و غرور کیوں؟
ترا تیر، تیرِ قضا نہیں اسے آزما کے بھی دیکھ لے

تری دلربائی کا پاس ہے۔ یہ نہیں کہ غم مجھے راس ہے
تو کہے تو اشک بھی روک لوں یہ لہو پلا کے بھی دیکھ لے

کہیں چھوڑ بھی یہ نہیں نہیں، کسی بات کا بھی یقیں نہیں!
غمِ عشق ہے غمِ لا دوا کہیں دِل لگا کے بھی دیکھ لے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

والدہ مرحومہ کی یاد میں!

عرصۂ کون و مکاں پر یوں تو چھا جاتا ہے دل!
موت کی اک شہ سے لیکن مات کھا جاتا ہے دل!
جیسے نوکِ خار پر ہو قطرۂ شبنم کوئی!
غم کے ہر احساس سے یوں تھرتھرا جاتا ہے دل
ڈولتا ہے جب کسی کی زندگانی کا جہاز!
تھامتا ہوں لاکھ پھر بھی ڈگمگا جاتا ہے دل!
جب بجھاتی ہے چراغِ زیست کو بادِ فنا!
کانپ اُٹھتا ہے اچھل کر منہ میں آجاتا ہے دل
دیکھ کر نوعِ بشر کو موت کا صیدِ زبوں!
گھٹتا جاتا ہے نفس اور ڈوبتا جاتا ہے دل!

جب گُلِ ہستی جھلستا ہے سمومِ موت سے
دھک سے رہ جاتا ہے غم سے تلملا جاتا ہے دِل
جب کہ بن بن کر بگڑتے ہیں نقوشِ زندگی
مضطرب سی ایک دھڑکن میں سما جاتا ہے دِل
گھر ہی میں جب آگ لگ جائے تو جل جائے نہ کیوں؟ یہ شگوفہ آتشیں جھونکوں سے مُرجھائے نہ کیوں؟

کون ہے جو آج پُرساں ہو دِلِ مغموم کا!
حرزِ جاں غم ہو گیا ہے مادرِ مرحوم کا!
کار آمد کل بساطِ زیست کا مُہرہ تھا مَیں!
آج ڈھونڈ لایا ہُوا نقطہ ہوں مَیں مقسوم کا!
کھیلتی تھی کل تو ہونٹوں پر مسرت اور آج!
درد میں ڈوبا ہے ہر نالہ دِلِ مظلوم کا!
ہو چُکا ہے اب سکونِ زندگی زیر و زبر!
دِل ہے اور ماتم ہے اب اِک ہستیٔ معدوم کا!
رُوح ہے مجرُوح غم سے جاں نکل جانے کو ہے کیا قیامت ہو گی جو بعد آج کے آنے کو ہے

کر نہ مجھ کو صبر کی تلقین تُو اے ہمنشیں!!

بند سے چڑھتا ہوا دریا بھی رُکتا ہے کہیں!
جس طرح بیٹھا ہو محمل میں نگار لالہ رُخ!
اس طرح ہیں آنکھ کے پردوں میں اشکِ احمریں
دھجیاں ہیں میرے دامن کی فضا میں منتشر،
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں دیکھ جیب و آستیں!
آنسوؤں میں جھلملاتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور تو کہتا ہے اِن میں خوں کی آمیزش نہیں!
لے گیا ہے شاخِ گُل سے توڑ کر گلچیں کا ہاتھ،
پھُول! تھی شاداب جس سے اپنے گھر کی سرزمیں!
آج ہیں خاموش کیوں وہ ہونٹ، بہتی تھی مُدام
جن سے ہنگامِ تکلم ایک جُوئے انگبیں!
مُجھ کو حیرت ہے کہ اُس کی فطرتِ آزاد کیوں؟
ہو گئی ہے ایک تنگ و تار حجُرے کی مکیں!
دیکھتی تھی جو عیاں ارض و سما کے راز کو!
کسقدر بے نوُر ہے اب وہ نگاہِ پاک، بیں؟

ہمنشیں ممکن نہیں میں لاسکوں تحریر میں   چرخ نے لکھی ہیں جو بے تابیاں تقدیر میں

کشتیٔ عمرِ رواں بحرِ فنا میں چھوڑ دی!

بادباں، مستول، ہر شئے آسرے کی توڑ دی!

کھیلتا ہے جس طرح بچّہ کھلونوں سے کوئی

اِس کے بازو موڑ ڈالے اُس کی گردن توڑ دی

اِس کے ہاتھوں پر لگائی ضرب اُس کی ٹانگ پر

ناک اِس کی کھینچ لی اور آنکھ اُس کی پھوڑ دی

ہے یونہی دستِ قضا میں زندگانی کی عناں!

جب بھی چاہی جس طرف چاہی اُدھر کو موڑ دی!

ہے فلک کے دام میں تدبیر اک صیدِ زبوں !   سایۂ شاہیں میں ہو جیسے کبوتر سرنگوں !

مادرِ مشفق بتا تو کس جگہ رُوپوش ہے؟

کون سی بستی ہے جس میں استراحت کوش ہے

"صدقے جاؤں" جو کہا کرتی تھی مجھ کو ہر گھڑی

وہ زبانِ شکّر افشاں آج کیوں خاموش ہے

کل بھری تھی جس کی گودی مامتا سے آج آہ!

قبر کی تاریکیوں میں وہ ننھی آغوش ہے

سب بہن بھائی ہیں تیرے غم میں دلگیر و ملول!

دائمی فرقت میں تیری کس کو کس کا ہوش ہے؟

کاروانِ زیست کی یہ آخری منزل نہ ہو!

ایک مٹی کا گھروندا ہے جو سبزہ پوش ہے

سایۂ شفقت تھا جس کا سایۂ لطفِ خدا! آج صد افسوس میرے سر سے ہوتا ہے جُدا

کیا دکھانے کو ہے میرے گھر کی ویرانی مجھے!

لے چلی یارب کدھر غم کی فراوانی مجھے!

اُف! یہ بے تابی یہ دل کی بے قراری الاماں!

پھونک ہی ڈالے گی میری حشر سامانی مجھے!

چشمِ خامہ تاکہ اشکِ غم سدا روتی رہے

سونپ دی قدرت نے تیری مرثیہ خوانی مجھے

اپنا گھر جو رشکِ باغِ خُلد تیرے دم سے تھا

کاٹنے کو دَوڑتی ہے اُس کی ویرانی مجھے

آج جو بنتا ہے کل کیوں ٹوٹ جاتا ہے وُہی

اِن کرشموں نے کیا ہے وقفِ حیرانی مجھے!

کھُل گیا آخر اجل ہے حلِّ اسرارِ حیات! کشمکش ہیں زندگی کی ہے نمودِ کائنات!

اِسقدر شفقت سے ہم کو پیار کر سکتا ہے کون؟
رُوح کی سوتی کلیں بیدار کر سکتا ہے کون؟
کون دے سکتا ہے ٹوٹے دل کو پیغام سکوں
من کو میٹھے پریم سے سرشار کر سکتا ہے کون؟
جس ہیں ہو جاتا ہے گھر کر آدمی مجبورِ زیست
غم کا وہ حصنِ حصین مسمار کر سکتا ہے کون؟
ٹھان لے جب وہ مٹا دینے کو نقشِ زندگی
تو اجل سے کاوش وپیکار کر سکتا ہے کون؟
کس قدر بے لوث کتنا پاک ہے ماتا کا پریم!
اس حقیقت سے بھلا انکار کر سکتا ہے کون؟

دینوی عظمت بھی ہے رفعت بھی ہے راحت بھی ہے بلکہ سچ پوچھو تو ماں کے پاؤں ہیں جنّت بھی ہے

گر گیا ہے میری نظروں سے وقارِ زندگی!
چھوڑ دی ہے ماسوا سے دِل نے اب وابستگی!

موت کو تسخیر کر لیتا کہیں ممکن بھی ہے
کوشش بے سود تھی میرا نیاز و بندگی!
وائے ناکامی نہ سوکھا موت کا سنگین ہاتھ
عشق شعلہ ریز کی باطل ہوئی افسوں گری!
تیرگئ غم کو نا ممکن ہے کر دیں ملیا میٹ،
مہر کی ضَو پاشیاں مہتاب کی تابندگی!
موت کے حملوں سے ہو جاتی ہیں دِل پر آشکار
عقل کی کوتاہیاں ۔ تدبیرِ کی درماندگی!
ہو رہی ہے بارشِ انوار تیری قبر پر !
چھن رہی ہے اوٹ سے پتّوں کی مدّھم چاندنی
اَور ساون رُت ہیں کالی بدلیوں کے سائے میں!
ہلکی ہلکی ننھّی بوندوں کی حسیں افتادگی!
اس لحد پر پھول برساتی رہے بادِ صبا ! شبنمی گوہر سدا لاتی رہے بادِ صبا !!
حاضریں کی ہے گواہی کہ سُنی تھی بار بار
آخری دم تیرے مُنہ سے کلمۂ حق کی پُکار

تو گئی تو لطفِ یزداں ساتھ رُخصت ہو گیا

سایۂ مادر تھا سر پر سایۂ پروردگار!

اس کی خاطر ہو گئی رُخصت سوئے باغِ جناں

کس قدر تھا اپنی بیٹی سے تجھے گہرا پیار!

اشک سے لبریز خود دیکھا ہے تیری آنکھ کو!

سوز میں ڈُوبی ہوئی مظلوم کی سُن کر پکار

ہے صدائے نالہ و فریاد سے معمُور آج!

دیکھ یہ افلاس کی بستی یہ غُربت کا دیار!

پونچھتی تھی جن کے آنسو اپنے دستِ مہر سے

میٹھی باتوں سے جنہیں دیتی تھی تو صبر و قرار

ہیں ترے خُلقِ نکو کے کس قدر احساں پذیر

ہیں ترے دستِ کرم کے کس قدر منّت گزار

زندگانی کے حوادث سے وہ مِٹ سکتی نہیں!

جو بنائی ہے دلوں میں تو نے مُحکم یادگار

جاؤں گا تیری لحد پر میں لہو روتا ہُوا!!

داغہائے سینہ کی جا کر دکھاؤں گا بہار!

تارِ مژگاں میں پرو کر قطرہ ہائے خونِ دل!

لاؤں گا بہرِ عقیدت میں یہ دُرِّ شاہوار!

اَور کچھ اِن میں دُعاؤں کے پرو کر تازہ پھُول!

قبر پر تیری چڑھاؤں گا مَیں یہ انمول ہار!

اپنے بالوں کو بناؤں گا ترا جاروب کش!

اَور مَیں پلکوں سے جھاڑوں گا تری خاکِ مزار،

میں لحد پر شمع سوزِ غم جلاؤں گا ضرور، آنکھ کے سوتوں سے خونِ دل بہاؤں گا ضرور!

منظوم افسانے

مامتا!

ہماری عقلِ ناقص راز کا حل پا نہیں سکتی! جو بات اب کہنے والا ہوں سمجھ میں آ نہیں سکتی!

عجیب اک واقعہ ہے یہ نگاہوں میں زمانے کی! حقیقت ہے مگر بو آتی ہے اس میں فسانے کی!

یہ مہرِ مادری کی داستانِ خونچکاں ہوگی! فغاں کے اس میں شعلے گریۂ سوزِ نہاں ہوگی!

دلِ درد آشنا کی سسکیوں کا سلسلہ ہوگا
محبّت اور اجل کی کشمکش کا ماجرا ہوگا

اُداسی چھا رہی تھی گاؤں کی سادہ فضاؤں میں! غموں کی آگ کے شعلے بھڑکتے تھے ہواؤں میں

ہر اک شے بزمِ ہستی کی فنا در جام تھی گویا! ہوا کی سائیں سائیں موت کا پیغام تھی گویا!

فضا میں تیرتے پھرتے تھے کچھ تاریک سے سائے وہ جن سے ضیق میں دل ہو وہ جن سے جان گھبرائے

بھیانک اور جانفرسا خموشی چار سُو طاری! زبانیں بند آنکھوں سے مگر اک جوئے خوں جاری

مکیں تھے غش میں گویا اور در و دیوار کو سکتہ کھڑکتے کس طرح پتّے کہ تھا اشجار کو سکتہ

اندھیرا رُوح پر آسیب بن کر چھائے جاتا تھا دھڑکتا جا رہا تھا دل کلیجہ منہ کو آتا تھا!

ہوا بارِ گراں سے غم کے بوجھل ہوتی جاتی تھی خوشی کی ہر جھلک آنکھوں سے اوجھل ہوتی جاتی تھی

خموشی تھی مسلط حالتِ دُنیا دگرگوں تھی !،
نہ چرواہوں کی ٹخ ٹخ تھی نہ چڑیوں ہی کی چوں چوں تھی

پرندوں نے سوادِ غم کا گویا سُرمہ رکھا یا تھا !،
چرندوں نے جُگالی تک سے ہاتھ اپنا اُٹھایا تھا !

الم کے قید خانہ میں مکیں محبُوس تھے سارے
سیہ چادر میں ظلمت کی مکاں ملبُوس تھے سارے

ہوا کی آنکھ سے شبنم کے آنسو بہتے جاتے تھے
زبانِ حال سے بیتی تھی جو کچھ کہتے جاتے تھے

تھے ٹھنڈے گاؤں کے چُولھے پڑے تھے کھیت بھی سُونے
سماں سنسان تھا قمری کو بھی چھوڑا تھا کُوکُو نے

صفِ ماتم بچھی تھی اَور سب خاموش بیٹھے تھے !
غمِ ہستی میں محزوں تھے جوان و پیر اَور بچّے !،

سبب یہ گاؤں کی اِک نیک عورت چل سدھاری تھی
وُہ عورت روتے روتے عمر سب جس نے گذاری تھی

عفیفہ بیوگی میں عمر کو جس نے گنوایا تھا !
ریاضِ دہر سے رختِ سفر اُس نے اٹھایا تھا !

لجا دیتی تھی حوروں کو بھی جس کی پاک دامانی
فرشتے ڈھانپ لیتے تھے پروں سے ننگِ عریانی !

جوانی جس کی گذری یاس کے مسموم دھارے پر
بڑھاپا جس نے کاٹا ایک بیٹے کے سہارے پر

وہ بیٹا اُس جوانا مرگ شوہر کی نشانی تھی !
جو گویا اس کے خوابِ زندگی کی اِک کہانی تھی

وہ بیٹا ماں کا دم بھرتا وہ ماں بیٹے کی شیدائی !
محبّت نے عطا کی تھی دلوں کو خوئے یکتائی

جو بیٹے اَور ماں میں پیار کا مضبوط رشتا ہے
یہی قانونِ قدرت ہے یہی فطرت کا منشا ہے

جواں تھا اَب وہ بیٹا زورِ بازو سے کماتا تھا۔
وہ آگے ماں کے رکھتا جو کمائی کر کے لاتا تھا

جہاں میں دونوں کے دونوں وہ زندہ تھے بھروسے پر
اسے ماں کا بھروسہ اَور ماں اس کے بھروسے پر

گیا پردیس کو اب فکر تھی روزی کمانے کی! چمن سے لے اُڑی اس کو تمنّا آب و دانے کی!
غمِ ہجرِ پسر نے کر دیا ہلکان ماتا کو! ہوئی گُل شمعِ ہستی اُس نے چھوڑا بزمِ دُنیا کو!

صفِ ماتم عزاداروں نے آکر گھر میں بچھوائی،
خبر اس سانحہ جانسوز کی بیٹے کو بھجوائی،

لہو کے اشک آنکھوں سے وہ برساتا ہُوا آیا! فغاں کرتا، سنبھلتا، گرتا چلّاتا ہُوا آیا!
سراسیمہ تھا گھٹتی جارہی تھی سانس چھاتی میں! غم و اندوہ کی اٹکی ہوئی تھی پھانس چھاتی میں!
کلیجہ پُھنک رہا تھا دیدۂ خونبار بھیگے تھے! اِدھر اُلجھے ہوئے تھے بال اُدھر رخسار بھیگے تھے
نہ اس کو جان کی پروا نہ تن کا ہوش باقی تھا! اگر کچھ تھا تو دل میں سوزِ غم کا جوش باقی تھا۔
جو حالت اُس کی اس صدمے سے تھی دیکھی نہ جاتی تھی! نفس کے ساتھ جانِ ناتواں بھی لب پہ آتی تھی!
اُڑی جاتی تھی رنگت پھیلتی تھیں زردیاں منہ پر رواں تھیں چشمِ پرنم سے لہو کی ندیاں مُنہ پر!
بہے جاتے تھے آنکھوں سے دلِ صد چاک کے ٹکڑے پریشاں تھے فضا میں دامنِ نمناک کے ٹکڑے

پھرا دیوانہ سا گھر میں رُکا امّاں کے لاشے پر!
بنا تصویرِ محرومی جُھکا امّاں کے لاشے پر!

وہ اس کے پاس آیا ہی تھا جو تھرّا گیا لاشہ محبّت کا اثر تھا وجد میں جو آگیا لاشہ!
کفن میں جُھرجُھری پیدا ہوئی آہ و فغاں اُٹھی! پسر کے دیکھنے کو ماں کی چشمِ ناتواں اُٹھی!

بدن کی لرزشوں سے ارتعاشِ دل ہویدا تھا ! اب آنکھیں دیکھتی تھیں اور اُن میں نور پیدا تھا
کُھلے جاتے تھے اسکے ہونٹ یوں سیلِ تکلّم سے ! کہ جیسے ہوں کلی کے بند وا جوشِ تبسّم سے !

لبوں سے تھرتھری کے ساتھ کچھ الفاظ بہہ نکلے !
کسی جھرنے سے جیسے پھُوٹتے ہوں جانفزا نغمے !

محبّت ہی محبّت کی تھی یہ سب معجزہ آرائی ! پھر اس میں آگئی تھی جان خلقت تھی تماشائی
محبت ہی سے آتی ہے رگِ جاں میں توانائی ! محبت ہی سے پاتی ہے زبانِ مُردہ گویائی
محبت ہی سے پیدا ہیں وہ تنویریں وہ تابانی ! جو عالم کو بنا دیتی ہیں اِک تصویرِ حیرانی
محبّت ہی سے رنگِ اختلاطِ باہمی پیدا ، محبّت ہی سے دنیا میں نشاطِ باہمی پیدا
محبت ہی سے عرصہ زارِ ہستی کا نسق قائم ، محبّت ہی سے نورِ آسماں رنگِ شفق قائم ،
محبّت ہی سے کلیوں کے تبسّم میں مہک پیدا محبّت ہی سے انجم کے نشیمن سے چمک پیدا

محبّت کا تھا یہ اعجاز اعجازِ مسیحائی !
دلِ ساکت کی پھر گہرائیوں سے یوں ندا آئی !

”مرا نورِ نظر آیا مرے دل کی دوا آئی ! مرے اُجڑے چمن میں پھر شمیمِ جانفزا آئی !
بہت اے جانِ مادر! تو نے اب کے راہ دکھلائی جدائی میں تری رخصت ہوئی تابِ شکیبائی
مگر مجھ کو تجھے دیکھوں اُدھر کا حکم تیّاری ! حیات اور موت کے مابین تھی اک کشمکش جاری

تجھے بن دیکھے چل دوں یہ تو مجھکو سخت مشکل تھا! اُدھر مشکل تھی مُرغِ رُوح اُڑ جانے پہ مائل تھا!

قضا کا میری جب پیکِ اجل پیغام لایا تھا! تو میری رُوح کو آمادۂ پیکار پایا تھا!

مگر دشوار ہے تقدیر کے لکّھے کا ٹل جانا! قضا کا جو معیّن وقت ہے اُس کا بدل جانا

ہوئی جذبِ محبّت سے اجل کو سخت مجبوری! جو دل کی چاہ تھی اُس کو ہلا انعام منظوری

جو میرے عزم و استقلال کو سنگِ گراں پایا، تو جاں لینے سے پہلے عہدِ پختہ موت نے باندھا

کہ واپس خوبیٔ تقدیر جب بیٹے کو لائے گی! تو میرے مُردہ تن میں رُوح پھر سے پھونکی جائیگی

مرے افسردہ ہونٹوں کا تکلّم آشنا ہونا!، یہ ہے اس عہد کا جو باندھا تھا مجھ سے وفا ہونا!

اِسی باعث تھا میرا مر کے پھر سے زندہ ہو جانا! مری اس آتشِ خاموش کا تابندہ ہو جانا

اگر تجھ سے نہ ملتی اور یہ مجھکو دبا دیتے نشانِ گور تک دنیا سے جو میرا مٹا دیتے!

تو پھر بھی جانِ مادر جب اُدھر تیرا گذر ہوتا! نظامِ دہر نالوں سے مرے زیر و زبر ہوتا!

کلیجہ آسماں کا کانپ جاتا دھرتی پھٹ جاتی مری چھاتی سے مٹّی اِک بگولا بن کے ہٹ جاتی

کفن کو پھاڑ کر میں چہرے سے اپنے ہٹا لیتی! ترے دیدار سے میں آتشِ دل کو بجھا لیتی!

عناصر کو بھی میری مامتا تسخیر کر لیتی! تماشائے فسونِ گردشِ تقدیر کر لیتی!

مگر اب ہو چکا ہے وقت لو اے جانِ جاں! رخصت

جہاں میں تا ابد قائم رہے تیرا نشاں۔ رخصت"

یہ کہہ کر ہو گئی خاموش وہ دیوار کی صورت ! چمک کر بجھ گئی جذبِ دلِ بیمار کی صورت !

یہ عالم دیکھ کر پہلے تو سنّاٹا رہا طاری ! پھر اشکِ گرم ہر اک آنکھ سے ہونے لگے جاری

پھر اُٹھے لوگ اس کو آخری منزل پہ پہنچایا ! حجابِ غرب میں خورشیدِ مہرِ مادری آیا !

اُدھر مٹّی دہانِ گور میں وہ بھرتے جاتے تھے
ادھر بیٹے کے نالے آسماں کا دل ہلاتے تھے

اے سکھی!

اے سکھی کیا یاد ہے تجھ کو وہ منظر یاد ہے
گھر سے ہم نکلی تھیں دونوں بن سنور کر یاد ہے
ہولے ہولے چپکے چپکے جب چلی تھیں سیر کو!
راستہ میں دیکھ کر ٹھٹکی تھی تو اِک غیر کو!
یاد ہے ناہو کے ہم نکلی تھیں جس کے پاس سے
جس نے ڈالی تھی نظر چہرے پہ میرے پاس سے
جو مجھے مشتاق نظروں سے سکھی! دیکھا کیا!
دُور تک جس کی نگاہوں نے مرا پیچھا کیا!
غیر وہ کوئی نہ تھا اے میری پیاری غمگسار!
بھید اپنا آج اِک کرتی ہوں تجھ پہ آشکار
وُہ مرے میکے کے گاؤں کا ہے البیلا جواں
گایا کرتا تھا جو اپنے دوستوں کے درمیاں!
اوٹ سے پتّوں کی جس کے گیت سُن لیتی تھی میں
دھیمی دھیمی نرم لَے پر سر کو دُھن لیتی تھی مَیں!
جاگ جاگ اٹھتی تھی شب کو بانسری کی تان پر!
دِل لٹا بیٹھی تھی اس بے حد حسین انسان پر!
کام کرتا تھا سحر جب وہ سہانے کھیت میں!
کھیلتی رہتی تھی میں نالے کی ٹھنڈی ریت میں!
جب نکلتا تھا لئے بیلوں کی جوڑی دھوپ میں
کرتی تھی بھگوان کا درشن میں اُسکے رُوپ میں
پوجتی تھی مورتی اُس کی سکھی ہر شام کو!،
سانس کی مالا پہ جپتی تھی میں اُس کے نام کو!
آزماتا تھا جو المردوں میں اپنا زور جب!
واہ وا کا جیت پر اٹھتا تھا اس کی شور جب!

پڑتا تھا میری آنکھوں میں نشیلا سا وقار
چومتا تھا میرے ہونٹوں پر مسرت کا خمار

اور ساون رُت میں انگنائی میں جب گاتا تھا راگ!
چار سُو نغمات کی لپٹوں سے بھڑکاتا تھا آگ!

میٹھی میٹھی راگنی کرتی تھی میرا جی گداز!
چھیڑتی تھی میں بھی چھپّر کے تلے چرخے کا ساز

کھلکھلاتے قہقہوں کا جب بجاتا تھا ستار
گیت بن بن کر ابلتا تھا مرے دل کا بخار

اے سکھی جب مُسکرا دیتا تھا میرے حال پر!
بوند اک پانی کی بہہ جاتی تھی میرے گال پر!

بات یہ تب کی ہے جب میں اے سکھی بیاہی نہ تھی!
جب گرہستی کی کٹھن منزل کی میں راہی نہ تھی!

لال دوشالہ سکھی جب تھا نہ کاندھوں پر وبال
پھُول کی پتی پہ فطرت نے نہ چھڑکا تھا گلال!

شرم کی محرم میں حسنِ ضوفشاں لپٹا نہ تھا!
دیکھنے والی نظر سے جب کوئی پردا نہ تھا!

آنکھ میں پرتو نہ تھا جب سرمئے تحریر کا!
زیست پر سایہ نہ تھا محرومئے تقدیر کا!

میری کلیوں کو جھلستی تھی نہ جب بادِ سموم!
تھا نہ میری آنکھ کے مطلع میں تاروں کا ہجُوم

مانگ میری تھی تہی مایہ ابھی سیندُور سے
نین پوری نوجوانی سے نہ تھے مخمُور سے!

چوڑیوں سے ہاتھ جب خالی تھے صندل سے جبیں!
سُرخ جوڑوں میں نہ گھبراتا تھا جسمِ نازنیں!

میرے جوبن نے ابھی پھُولوں کو شرمایا نہ تھا!
آنکھ تو کھولی تھی پورے ہوش میں آیا نہ تھا!

میں ہوں اب اور آہ اس بیتے سمے کی یاد ہے
اک خلش بن کر مرے ہردے میں جو آباد ہے

اے سکھی! چنچل سکھی! اتنا سا میرا کام کر!
پوچھ دل کی کیفیت جا کر اُسے پرنام کر!

ہے یقیں اب تک کھڑا ہو گا کہیں وہ راہ میں
اس سے کہہ دینا کہ اب تڑپے نہ میری چاہ میں

اُس سے کہہ دینا کہ مجھ کو کھا گیا ظالم سماج
ظلم لاکھوں میرے سر پر ڈھا گیا ظالم سماج!

اُس سے کہہ دینا گھٹا کلفت کی چھٹ سکتی نہیں
مرتے دم تک پاؤں کی زنجیر کٹ سکتی نہیں!

اس سے کہہ دینا مزارِ بے کسی میں گر چکی!
اوس میری آرزوؤں کے جہاں پر پڑ چکی

اس سے کہہ دینا کہ میں آزادیوں کو کھو چکی!
جیسی ہونی تھی مری قسمت میں اب وہ ہو چکی!

اس سے کہہ دینا خزاں نے لوٹ لی میری بہار
من کی چِتنا بن گئی آنکھوں کی ہلکی سی پھوار

اس سے کہہ دینا مزا الفت کا مجھ کو مل چکا!
آہ کی سختی سے سینہ بے نوا کا چھل چکا!

اُس سے کہہ دینا کہ اب پونجی دلِ بیتاب کی!
آہ کی سوزش خلش غم کی تڑپ سیماب کی!

اس سے کہہ دینا لڑکپن کی وہ باتیں بھول جائے
وہ خوشی کے روز وہ عشرت کی راتیں بھول جائے

اس سے کہہ دینا کہ جو دیکھا ہے وہ اک خواب تھا
گرچہ اپنی داستانِ دل کا زرّیں باب تھا!

اس سے کہہ دینا وہ باتیں غم کا ساماں ہو گئیں!
آنکھ میں آنسو لبوں پر آہِ سوزاں ہو گئیں

اس سے کہہ دینا کہ اب بیتے سمے کی یاد کیوں؟
کر رہا ہے اب تڑپ کر زندگی برباد کیوں؟

اُس سے کہہ دینا کہ تجھ کو بے کلی کا واسطہ　　اپنی معصوم اَور سہانی زندگی کا واسطہ

موڑ لے مجھ غم نشاں کی یاد سے منہ موڑ لے!

جوڑ لے ٹوٹے ہوئے ہر دے کے ٹکڑے جوڑ لے!

راجہ رانی!

سُن ری سجنی پریم کہانی!! پریم جگت کی ریت پُرانی!
ایک تھا راجہ راج کا والی! لشکر، تخت، اور تاج کا والی
ایک تھی اُس راجہ کی رانی سگھڑ منوہر میٹھی بانی
رانی سچ مچ من کی رانی! ہیرے کی تھی جوت جوانی!
نین مدھر ماتے متوالے لانبی پلکیں گیسو کالے
ہلکے، لال گلابی ڈورے سندر مست شرابی ڈورے!
ابرو تھامے تیز کٹاری آنکھوں میں کاجل کی دھاری
ماتھے پر سیندور کی بندی! شوخ نگاہیں، چتون تیکھی
بازو گورے، ہونٹ عنابی! چندر مکھڑا سُرخ شہابی!
جلد کی رنگت نکھری نکھری دوش پہ زلفیں بکھری بکھری
سینتیں من میں کھُبنے والی! کانٹا بن کر چُبھنے والی!
سندرتا اور روپ کی دیوی چاند کی بیٹی دھوپ کی دیوی

تیج بھرا وہ جوبن اس کا! تارے کرتے درشن اس کا
راجہ اس کا پریم پجاری وہ راجہ پر من سے واری
راجہ نینوں کا متوالا! وہ جیتی راجہ کی مالا!
راجہ اس کے باغ کا مالی وہ چمپا کی سندر ڈالی!
یہ پریہ وہ پریتم پیارا من دونوں کے پریم کی دھارا
وہ اس کے ہردے کی رانی! تن من دھن ہر شے کی رانی

دونوں پریمی دونوں پریتم!
گنگا جمنا کا سا سنگم

آ سجنی، کچھ اور بتاؤں! جو بیتی وہ بات سناؤں!
راج پہ تگڑی بپتا آئی! کہ دشمن نے آن چڑھائی
راجہ نے جب لشکر دیکھا بیری دشمن سر پر دیکھا
شہر کے باہر بھیجی رانی! مات پتا گھر بھیجی رانی!
یدھ کی خاطر راجہ نکلا! فوجیں لے کر راجہ نکلا
پل میں دشمن پر چڑھ دوڑا رن کی جانب باگ کو موڑا!
رن میں دشمن مار بھگائے اپنی حد سے پار بھگائے

راج سے اُن کو مار نکالا! بول ہُوا راجہ کا بالا!
سیتا نے پھر جیت منائی نگری میں اِک دھوم رچائی
گھر گھر خوشیاں کھیل تماشے ڈھول، نفیری، باجے تاشے
شہر میں روشن گھی کے دیپک سُکھ، آنند، خوشی کے دیپک
خوشی کے مارے پھُولا راجہ پیاری کو بھی بھُولا راجہ!
دُھن رانی کی نکلی من سے جیسے نکلے بُو گلشن سے
رنگ رلیوں میں ایسا کھویا! کوئی خط نہ سندیسا بھیجا!
رانی کو چنتا نے گھیرا! من میں ڈالا دُکھ نے ڈیرا
پی پی کرتی سانجھ سویرے کاگ اڑاتی بیٹھ بنیرے!
سمجھی مجھ سے موہن چھُوٹا! بھاگ ابھاگن کا اب پھُوٹا!
کیوں پریتم نے دُکھ میں ڈالا دال میں ہے کچھ کالا کالا
اس کے من میں چور سمایا! بیٹھے بیٹھے جی میں آیا!
ساجن کو پرکھا کر دیکھوں! کوئی ڈھونگ رچا کر دیکھوں
پیتل ہے یا سونا، پرکھوں! جھوٹا ہے یا سچا پرکھوں
کوڑی یا انمول جواہر! کیا ہے دیکھوں ٹھونک بجا کر

میں راجہ کی ہیبت کو دیکھوں! اس پریمی اس میت کو دیکھوں!

کیوں روٹھا ہے ساجن جانوں

بے مہری کا کارن جانوں!

تھی اس کی اک باندی پیاری بُدھی میں مردوں پر بھاری

اُس کو اپنے پاس بُلایا! من کا سارا حال بتایا!

بولی "جا اب راج دوارے! ایشور تیرے کاج سنوارے

سُندرتا کا جال بچھا دے اَور کاکل کی ڈور لگا دے

جا راجہ پر وار چلا ری من کا پنچھی پھانس کے لاری

کھوج لگا کچھ اُس کے جی کا!

میرا ہے یا اَور کسی کا!"

گھر سے وہ بن ٹھن کر نکلی! سندر داسی تن کر نکلی!

راج دوارے آئی باندی! پہلے کچھ شرمائی باندی

پھر بولی گھونگھٹ نیہوڑا کر! اپنا پیارا مُکھ دِکھلا کر!

"واہ راجن کیا شان ہے تیری کیسی آن اَور بان ہے تیری

چاند اَور سُورج تجھ پر صدقے دھرتی واری امبر صدقے!

کس ماتا نے جایا تجھ سا!   نہ دیکھا نہ پایا تجھ سا!
ترچھا بانکا چھیل چھبیلا!   موہن سندر روپ سجیلا
ترچھے ابرو بال سنہری!   کاندھے پر اک جال سنہری
گورا مکھڑا کالی آنکھیں!   دل موہ لینے والی آنکھیں
سر پر صافہ دوش پہ پٹکا!   پیٹھ کے پیچھے ترکش لٹکا
پہلو میں تلوار لگی ہے !   باپنّے کی جوت جگی ہے
کلغی پر ہیں سچے موتی !   ہار گلے کا ہیرے موتی!
راجن تیری چھب پر واری   چال اور سج سب پر واری
میں داسی ہوں پریم پجارن!   دوارے کی اک نیچ بھکارن
"تو آقا میں چیری راجن   تو کس کا میں تیری راجن"!
"میں رانی کا ہوں سن باندی!   اپنی جان کی دشمن باندی"!
"راجن داسی تیرے بس میں"   "رانی میری ہر ہر نس میں"
"کیا راجن وہ اچھّی مجھ سے"؟   "ہاں داسی وہ سندر تجھ سے"
"راجن میں وایو کا جھونکا"!   "باندی وہ ساون کی برکھا"!
"میں راجن آکاش کا تارا"!   "وہ سورج کا شوخ نظارا"

"میں کلیوں کا روپ جوانی"   "باندی وہ پھولوں کی رانی"

"میں چندرماں رین اُجالا"   "وہ باندی دو نین اُجالا"

"میں مدرا کی پریم پیالی"   "وہ آپ اِک انگور کی ڈالی"

"میں گل کی مہکار کی دیوی"   "وہ بن اور گلزار کی دیوی"

"میں کِونا ہوں راج کوی کی"   "وہ گیتا جگت راج ہری کی"

"پھولوں کا رس میرا جوبن"   "تاروں کی لو اس کا جوبن"

"لچھمی کا اوتار ہوں راجن!   دولت کی جھنکار ہوں راجن"

"دولت ڈھلتا پھرتا سایا!   وہ خود لچھمی وہ خود مایا"

"قدرت کا پیغام ہوں راجن   جیٹھ کی نکھری شام ہوں راجن"

"وہ پربھات کا اُجلا منظر!   دِلکش پیارا پیارا منظر"

"میں عشرت کا ساز ہوں راجن   الفت کی آواز ہوں راجن"

"وہ فِطرت کا گیت ہے باندی   وُہ تو پیت ہی پیت ہے باندی"

"راجن میری زاری سُن لے   دُکھ بپتا کو واری سُن لے"

"میں ناگن تو مست سپیرا!   میں تیری تو ہو جا میرا"

"میں کیسے ہو جاؤں تیرا!   میرے من پر یہ کا ڈیرا"

"آگ اور جل کا میل نہیں ہے　　پیت ہے باندی کھیل نہیں ہے"
"راجن تیرا قول غلط ہے　　اِس کانٹے کی تول غلط ہے
پیت بھی جھوٹی پیار بھی جھوٹا!　　بات بھی قول اقرار بھی جھوٹا!
جو ٹوٹے وہ پیت نہیں ہے!　　جو بھولے وہ میت نہیں ہے
تو جو بات کا پکّا ہوتا!　　تیرا پریم جو سچّا ہوتا!
تو کیوں رانی پی پی کرتی!　　کیوں روتی کیوں آہیں بھرتی
کیوں ہردے کا نیر سکھاتی　　کیوں فرقت میں خون بہاتی!

کیوں سینے پر آرے چلتے
کیوں پلکوں سے آنسو ڈھلتے"

راجہ اس کا مطلب سمجھا!　　جو سمجھاتی تھی سب سمجھا!
قاصد بھیج بُلائی رانی!　　راج محل میں آئی رانی
بچھڑے پریمی ملے ملائے!　　دل کے غنچے کھلے کھلائے

چل سجنی اب گھر کو جائیں!
پیت کی ہم بھی پینگ بڑھائیں

ستی!

وہ افق پر اُن پہاڑی سلسلوں کے درمیاں	اُٹھ رہا ہے نور کی، کرنوں میں نورانی دھُواں
دھیرے دھیرے پھیلتا جاتا ہے چاندی کا غبُار	بہ رہا ہے دُود کی موجوں کا سیمیں آبشار!
دُھن رہے ہیں روئی کے گالے ہوا کے دوش پر	تن رہے ہیں نقرئی جالے ہوا کے دوش پر!
یہ دھواں ہے یا مجسّم جلوے بام حسُن کے!	ننّھے ننّھے خوشنما حلقے ہیں دامِ حسن کے
پھڑ پھڑا کر پر اُڑے جاتے ہیں مُرغانِ سپید!	اُبھرے دُودِ نور بن کر سینۂ گیتی کے بھید!
آسماں کے دامنِ ابلق پہ جھالر نوُر کی!	یا کوئی غازہ کی ڈبیا آسمانی حوُر کی!

ہاتھ سے نیچے گری اور گرتے گرتے کھُل گئی
اور فضا میں اس کے ذرّوں کی سپیدی گھُل گئی

یہ دھُواں کیا ہے کتابِ زندگانی کا غلاف!	یہ دھُواں کیا ہے مزارِ شادمانی کا غلاف!
یہ دھوُاں کیا ہے رِدا عصمت کی عریاں لاش پر	بوئے گُل سے بھی سبک ریشم سے بھی باریک تر

یہ دھواں کیا ہے کفن ہے حسرتوں کی لاش کا ! اس کے دامن پر رقم ہے بے لبسی کا ماجرا
یہ دھواں کیا ہے چٹختی ہڈیوں کا پردہ پوش ! کانپتے ہونٹوں کی سسکی، ٹوٹتے دِل کا خروش
یہ دھواں کیا ہے فسردہ آرزوؤں کا لہُو ! آ رہی ہے اس سے اِک جلتے ہوئے لاشے کی بُو
یہ دھواں کیا ہے اجل کا ایک کڑوا زہر خند ! اس کے حلقوں میں پسی جاتی ہے جانِ دردمند
یہ دُھواں کیا ہے نوشتہ ہے کوئی مقسوم کا !
جل رہا ہے اس کے نیچے لاشہ اِک مظلوم کا !
نعش اس کرموں جلی کی جل رہی ہے آگ میں چار دِن کا سُکھ بھی لکھا تھا نہ جسکے بھاگ میں
جس کا شوہر کھیلنے نِکلا تھا گھر سے جان پر ! مضطرب تھا، سر کٹانے کو وطن کی آن پر !
جاں بکف ہو کر چلا تھا جو وطن کے واسطے ! بلبلیں قربان ہوتی ہیں چمن کے واسطے !
سج کے ہتھیاروں سے غرّاتا ہُوا وہ شیرِ نر
کرنے نِکلا تھا حریفوں کی صفیں زیر و زبر

اِک سپاہی نے جو بیدھا آ رہا تھا جنگ سے کر کے ہاتھوں کو حنا آلود خوں کے رنگ سے
مرنے والی کو بتایا تھا کہ "تیرا پران ناتھ" چھوڑ بیٹھا ہے ہمیشہ کے لئے جیون کا ساتھ
تیرا سوامی جنگ کے میدان میں کام آ چُکا ! اس کے ہونٹوں تک شراب موت کا جام آ چکا

پی چکا ہے زہر آلودہ پیالہ موت کا! ہائے اب وہ بن گیا ہے تر نوالہ موت کا!
وہ دھنی تلوار کا، وہ سورما، وہ شہسوار ہو چکا ہے موت کے پُر ہول پنجوں کا شکار
وہ شجاعت کا نمونہ وہ بہادر شور بیر! کھا چکا ہے موت کے میدان میں دشمن کا تیر

وہ وطن کا لال وہ بھارت کا البیلا سپوت
دے چکا ہے مر کے اپنی زندگانی کا ثبوت!

یہ سنا ہی تھا کہ پونجی ضبط کی لٹنے لگی! سانس سینہ چھوڑ کر حلقوم میں گھٹنے لگی!
تلملائی، دل میں ٹیسیں درد کی اٹھنے لگیں برچھیاں سینے میں حزن و یاس کی کھُبنے لگیں!
سوزِ دل نے آگ برسائی، زباں جلنے لگی! نطق کے سانچے میں دل کی کیفیت ڈھلنے لگی!

ڈوبتی آواز میں درد آشنا کہنے لگی!
قلب کی روداد یوں الفاظ میں بہنے لگی!

کھے سکوں گی کس طرح قلب و جگر کو ہار کے زندگی کے پانیوں میں ناؤ بن پتوار کے!
آہ جب ہوں گی میں طوفانِ بلا کے سامنے کون آئے گا توانا بازوؤں میں تھامنے!
کون دیگا دِل کو ڈھارس اب اندھیری رات میں کون لپٹائے گا چھاتی سے بھری برسات میں!
کون ہونٹوں سے چھوئے گا زلفِ عنبر بار کو! یاد کس کی گدگدائے گی دِلِ بیمار کو!
کون ڈالے گا مری گردن میں بانہیں پیار سے کس کے پیاسے ہونٹ مس ہونگے مرے رُخسار سے

کون ہے جو دل لٹا دے گا مرے انداز پر! — جھوم جائے گا جو جھانجھر کی حسیں آواز پر!

کون ہے جس کیلئے ہونگے نگاہوں میں شرر — لب پہ مسی، مانگ میں سیندور، بالوں میں گہر

کون ہے جس کا مجھے راتوں کو ہوگا انتظار — زندگی بے کیف ہے کیسی خزاں کیسی بہار

کون ہے اب جس کی شہ زوری پہ ہوگا مجھکو ناز — کس کے قدموں میں پڑھینگی جھک کے اب آنکھیں نماز

کس کی خاطر آہ اب مہندی رچے گی ہات میں! — دھڑکنیں دل کی سما جائیں گی ہر اک بات میں

کس کی خاطر حسن کی چتون پہ ہوں گی شوخیاں! — کس کے دل کو کسمسائیں گی کھنک کر چوڑیاں!

کس کی خاطر چومنے آئے گی آنکھوں کو حیا! — حسن کے جلوے بنیں گے اِک بھبوکا نُور کا!

کس کی خاطر حسن کی زینت جوانی کا سنگار — آنکھ میں جھُومے گا کس کے پریم کا میٹھا خمار

کس کی خاطر سیج پر میں شب کو بکھراؤنگی پھُول — میری آنکھیں اور ہوگی کس کے اب قدموں کی دھُول!

کس کی خاطر نزہتیں برسائے گا ابرِ بہار! — موتیوں سے بھر کے جھولی آئے گا ابرِ بہار

کس کے آغوشِ محبت میں مجھے نیند آئے گی! — یاد کس کی تھپکیاں دے دے کے اب بہلائیگی!

دن کو اپنے بام پر میں ہونگی کس کی منتظر؟
کس کی آہٹ پر لگیں گے کان اب شام وسحر"

مُنہ سے یہ الفاظ کہہ کر دفعتاً وہ رُک گئی! — ناتوانی نے کمر دوہرائی، گردن جھُک گئی!

کپکپائے ہونٹ رُخ پر مُردنی چھانے لگی! — جانِ نازک موت کے جھونکوں سے تھرّانے لگی!

ہوگی کا اس کو جانفرسا تصوّر کھا گیا !　　　پتلیاں پتھرا گئیں اور دم لبوں پر آ گیا !
وہ رنڈاپے کی بھیانک چتونوں سے ڈر گئی !　　　آسماں کی سمت دیکھا آہ بھر کر مر گئی !
جب سنا پرلوک کے باشی ہوئے پیارے پتی !　　　ست کی پوری پران دے کر ہو گئی وہ بھی ستی !

جو چتا پر جل رہی تھی یہ اسی کی لاش تھی !
دن کی گرمی میں پگھلتی برف کی اک قاش تھی !

چاٹتی ہے اِس طرف لاشے کو شعلوں کی زباں !　　　جا رہا ہے اُس طرف سے ایک البیلا جواں !
چار آئینہ لگائے ہاتھ میں نیزہ لئے　　　جو کھچے مردانگی کی آگ پر، وہ مے پیئے
پیٹھ کے پیچھے کماں، تیروں کا ترکش دوش پر　　　تمتماتا رنگ، ہردے کی امنگیں جوش پر
آہنی ہے خود سر پر اس پہ کلغی کی بہار !　　　جھانکتا ہے آنکھ کے روزن سے مردانہ وقار
جھومتا جاتا ہے منہ ہی منہ میں کچھ گاتا ہوا !　　　راگنی کی آنچ سے سینے کو گرماتا ہوا !
یہ بہادر جو شجاعت کے نشہ میں چور ہے　　　یہ وہی ہے جسکے مرنے کی خبر مشہور ہے
یہ وہی تو ہے وہی ہاں ہاں وہی۔ بیشک وہی　　　گاؤں کا رکھشک، وطن کا سورما۔ اس کا پتی !

جو سُنا وہ جھوٹ تھا یا اجنبی کی بھول تھی !
جس نے دے کر یہ خبر اک زندگی برباد کی !

کس قدر مسرور ہے بشاش ہے شاداں ہے یہ　　جس کو کوئی غم نہیں دنیا میں وہ انساں ہے یہ
جیت کر آیا ہے رن سے اس لئے مسرور ہے　　کامراں ہے، کامرانی کے نشہ میں چور ہے!
گیت بن بن کر لبوں پر گنگناتی ہے خوشی!　　کھلتے عارض پر اداسے مسکراتی ہے خوشی!
ہے تبسّم لب پہ اور گردن تنی ہے شان سے　　اتنا غرّہ کس لئے؟ پوچھو ذرا ناداں سے!
اس کو کیا معلوم اس کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا:　　بخت پھوٹا اور گھر اجڑا مقدّر سو چکا!

اس کی قسمت کے ستارے پر گھٹائیں چھا گئیں!
اس کے اختر کی ضیائیں کہر سے دھندلا گئیں!

کیا اسے کہہ دوں لٹی تیرے گلستاں کی بہار　　یہ مسرت عارضی ہے، یہ خوشی ناپائیدار،
کیا اسے کہہ دوں کہ جو پرنم بہاروں میں پلی!　　موت کے مسموم جھونکوں نے جھلس دی وہ کلی
کیا اسے کہہ دوں وہ تیری آنکھ کی پتلی کا نور!　　بن گئی ہے سورگ کی اک اپسرا جنّت کی حور!

رنگِ لافانی وہ تصویرِ وفا میں بھر گئی!
مرنے والی مر کے اپنا نام زندہ کر گئی!

مجھ کو سب معلوم ہے لیکن بتاؤں کس طرح　　دل میں جو کچھ ہے زباں پر اس کو لاؤں کس طرح
نطق عاجز ہے مرے دل کی بتا سکتا نہیں!　　یہ سمندر ایک چلّو میں سما سکتا نہیں!
رنج بے پایاں ہے یہ اور تنگ ہے نائے سخن　　لڑکھڑا جانے کو ہیں اس بوجھ سے پائے سخن

ہے یہی اچھا اسے اس کی رضا پر چھوڑ دوں! جو ہُوا، جو ہونے والا ہے، خدا پر چھوڑ دوں

راز کے چہرے سے خود پردہ اُٹھا کر دیکھ لے

اِک ذرا سی بھول کا انجام جا کر دیکھ لے